طلوعِ اسلام

جون ۱۹۴۸

ایک روپیہ

Tolu-e-Islam Magazine
June 1948
Fehrist

مولانائے عثمانی ظلہ	page 1
ہماری رفتارِ ترقی	page 2
مجلس دستور ساز (پاکستان) کی کارروائی	page 3
پاکستان کے مسلمانو!	page 4
لمعات	page 6
حقائق و عبر	page 17
طاؤس و رباب اول، طاؤس و رباب آخر	page 33
پارٹیاں کس طرح ختم ہو سکتی ہیں؟	page 38
قرآنی تعلیم	page 47
فلسطین	page 54
"علماءِ ہند"	page 102

مولانائے عثمانی مدظلہ

(یہ خبر پڑھ کر کہ ۲۲ رمئی کو شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نے کراچی میں
حلوا سوہن کی ایک دوکان کی رسم افتتاح ادا فرمائی)

علم کا مخزن ہے مولانائے عثمانی کی ذات　　پوچھتے ان سے مسلماں معنیٔ فوز و فلاح
پوچھتے ان سے کہ کیا ہے فرد و ملت کیلئے　　فتنہ ہائے عصرِ نو میں صورتِ خیر و صلاح
پوچھتے ان سے کہ لادینی سے کرنے کو جہاد　　دینِ فطرت نے مہیا کر دیئے کیا کیا سلاح
پوچھتے ان سے کہ ہے اہلِ تجارت کیلئے　　نفع کس حد پر حرام اور کونسی حد تک مباح
تا نہ ہونے پائے کوئی بات قرآں کیخلاف　　ہر نئی تجویز پر لیتے وزیر ان سے صلاح
ملک میں کیونکر ہو آئینِ شریعت کا نفاذ　　مشورہ ان سے یہ کرتے قائدِ اعظم جناح
دیکھئے اہلِ کراچی کا مگر ذوقِ لطیف　　چاہتے ہیں ان سے حلوے کی دکاں کا افتتاح
خوب ان لوگوں نے پہچانی ہے مولانا کی قدر　　خوب ان اللہ کے بندوں کو سوجھا ہے مذاح

کیا عجب ہے کچھ دنوں میں ان سے پڑھوانے لگیں
بس جنازے کی نماز اور خطبۂ عقدِ نکاح

(جناب اسحٰق ملتانی)

ہماری رفتارِ ترقی

اگست ۱۹۴۷ء	بیانات
ستمبر ۱۹۴۷ء	بیانات
اکتوبر ۱۹۴۷ء	بیانات
نومبر ۱۹۴۷ء	بیانات
دسمبر ۱۹۴۷ء	بیانات
جنوری ۱۹۴۸ء	بیانات
فروری ۱۹۴۸ء	بیانات
مارچ ۱۹۴۸ء	بیانات
اپریل ۱۹۴۸ء	بیانات
مئی ۱۹۴۸ء	بیانات

مجلس دستور ساز (پاکستان) کی کارروائی

جملہ اہالیان پاکستان کی نگاہیں، نہایت بے تابی سے پاکستان کی مجلس دستور ساز کی طرف لگ رہی ہیں۔ اس لئے کہ جب تک پاکستان کا آئین مرتب نہیں ہوتا یہ "سرزمین بے آئین" رہے گی۔ ۱۰ر اگست سے آج تک مجلس آئین ساز نے جو کچھ کیا ہے ۲۰ر مئی تک اس کی رپورٹ حسب ذیل ہے۔

۱۰ر اگست ۱۹۴۷ء — آنریبل مسٹر منڈل عارضی صدر منتخب کئے گئے۔ اور روزمرہ کے کاروبار، مثل انتخاب صدر وغیرہ سے متعلق ریزولیوشن پاس کئے گئے۔

۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء — انتخاب مستقل صدر۔ قومی جھنڈے کے متعلق ریزولیوشن۔ دو کمیٹیوں کی تعیناتی۔ اراکین کا الاؤنس مقرر کرنے کے اختیارات۔

۱۲ر اگست — ایک اور کمیٹی کی تعیناتی۔ یہ فیصلہ کہ صدر کو منتخب کرنے کا انداز کیا ہو۔

۱۴ر اگست — لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا تخاطب۔

۲۴ر فروری ۱۹۴۸ء — روزمرہ کی کارروائی اور صدر کے اختیارات کے قواعد پر بحث۔ ایک اور کمیٹی کی تعیناتی۔

۲۵ر فروری " — تسلسل بحث متعلقہ قواعد مذکورہ صدر

۲ر مارچ — اختتام بحث مذکورہ صدر۔ منظوری قواعد۔ انڈین انڈی پنڈنس ایکٹ کی ترمیم کابل۔

۱۵ر مئی
۱۸ر مئی — روزمرہ کے قواعد و ضوابط کی ترمیمات پر بحث۔

کل ۹ دن

فرمائیے! اب بھی آپ کو گلہ ہے کہ پاکستان کا آئین نہیں بن رہا!

اب اور چاہتے کیا ہو؟ پیمبری مل جائے!

پاکستان کے مسلمانو!

تم نے ابھی تک کشمیر کی اہمیت کا غالباً صحیح صحیح اندازہ نہیں کیا۔ تم نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ لڑائی سرحد کے پٹھانوں اور کشمیر کے ڈوگروں کی ہے۔ حالانکہ یہ جنگ براہ راست تمہارے خلاف ہے۔ کشمیر کی حفاظت تمہاری اپنی حفاظت ہے۔ تمہارے بال بچوں کی حفاظت ہے۔ تمہاری عزت و ناموس کی حفاظت ہے۔ تمہارے جان و اموال کی حفاظت ہے۔ تمہاری تہذیب و معاشرت کی حفاظت ہے۔ ہر اُس شے کی حفاظت ہے جو تمہیں عزیز ہے۔ پھر حیرت ہے کہ اس کے باوجود تم نے اسے اوروں کی جنگ سمجھ رکھا ہے۔ ہندو کے عزائم بڑے مشئوم اور اس کی تدابیر بڑی دوررس ہیں۔ تمہارے سرحدی بھائیوں نے اس وقت تک اپنے خون کی قیمت سے ان کے ارادوں کو مٹی میں ملائے رکھا ہے۔ لیکن وہ تنہا اس سیلاب کا مقابلہ کب تک کر سکیں گے؟ ہو سکتا ہے کہ حکومت پاکستان اس باب میں بین الاقوامی قوانین و مصالح سے مجبور ہو لیکن تمہیں تو کوئی مجبوری نہیں ہے۔ تمہارے بھائیوں کو تمہاری ہر قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ اب تم انگریز کے غلام نہیں ہو کہ تمہاری تگ و تاز فقط جلوس اور ہڑتال تک محدود رہے۔ اب تم آزاد مسلمان ہو۔ اٹھو! اور اپنے کشمیری محصورین اور سرحدی مجاہدین کی ہر طرح مدد کرو۔ روپیہ۔ کپڑا۔ دوائیاں۔ اشیائے ضروری۔ جو کچھ بن پڑے۔ انہیں بھیجو اور اس کے ساتھ ہی اپنی دعائیں اور حسین تمنائیں بھی۔ تم سات کروڑ مل کر ایسی متحدہ آواز بلند کرو کہ دنیا کی قوتیں عدل و انصاف پر مجبور ہو جائیں۔ اگر وہاں استصواب کی صورت پیش آئے تو وہاں کے مسلمانوں کو ایسی سہولتیں بہم پہنچاؤ کہ ہر شخص اپنے ضمیر کی آواز مقام متعلقہ تک پہنچا سکے۔ خدا کے لئے باتیں کم کرو۔ کام زیادہ کرو۔

اللہ کی نصرت تمہارے ساتھ ہو گی!

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

یورپ کی عیسائی سلطنتیں اپنی ساری تاریخ میں صرف ایک موقع پر متحد ہوئی تھیں اور وہ موقع تھا جب وہ اسلام کے خلاف صلیبی جنگوں کے محاذ پر جمع ہوئی ہیں۔ اُن جنگوں میں اُنہیں ایسی استخواں شکن شکست ہوئی ہے کہ اسکی چوٹ ان کے تحت الشعور میں آج تک موجود ہے اور وہ اس کے انتقام کے لئے اس وقت تک زخم خوردہ سانپ کی طرح تلملا رہی ہیں۔

آج ان کی تمام طاغوتی قوتیں ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے خلاف متحد ہو رہی ہیں اور اس دفعہ ان کا محاذ سرزمین فلسطین ہے۔ امریکہ، روس، یورپ کی مختلف مملکتیں، سب اپنے بنیادی اور اصولی اختلافات تک پس پشت ڈال کر، ایک مقصد ملعون و مردود کی خاطر ایک نقطہ پر جمع ہو رہی ہیں۔ تو کیا دنیا کے مسلمان، جن میں کوئی بنیادی اور اصولی فرق نہیں۔ جو بنیادی اور اصولی طور پر ایک ہیں۔ اس معاملہ میں الگ الگ رہیں گے؟ اگر دنیا کا ایک مسلمان بھی اس مسئلہ میں الگ رہا تو قسم ہے اس خدائے برتر کی جس نے ارض فلسطین کو بابرکت کیا ہے ایسے مسلمان سے دنیا اور آخرت کی سب برکتیں چھن جائیں گی اور اس کا شمار محرومین و مرجومین میں ہوگا!

پاکستان کے مسلمانو! تم نے اپنی محکومی کے زمانہ میں کبھی لارڈ ارلنگٹن کی یاد میں اپنے سینوں کو داغ داغ بنایا اور کبھی مارکس کے غم میں اپنی آنکھوں کو وقف خونابہ فشانی رکھا۔ گاہ ایران کی ویرانی پر اپنے گھروں میں صف ماتم بچھا دی اور گاہ سمرنا کے بچوں کی حفاظت کیلئے اپنی سحر گاہی مناجاتوں کو بام عرش تک پہنچایا۔ یہ سب کچھ تم نے اپنی محکومی کی حالت میں کیا۔ تو کیا اب اپنی آزادی کے زمانہ میں، تمام عالم اسلامی کی اس مصیبت کبریٰ اور نائبہ عظمیٰ پر تم فقط ریزولیشنوں پر ہی اکتفا کرو گے! سر جوڑ کر بیٹھو اور سوچو کہ فلسطین کے مجاہدین کو کس کس چیز کی ضرورت ہے۔ اور پھر ان کی ہر ضرورت کے مہیا کرنے میں رات دن ایک کر دو۔ خدا شاہد ہے آج اس سے بڑا عمل صالح اور کوئی نہیں ہے۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

طلوع اسلام اپنے دورِ اول میں، حکومت کے دفاتری نظم و نسق کے متعلق بہت کم دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ایک بیگانہ حکومت تھی جس کے دفاتری انتظامات کے حسن و قبح سے ہماری ملی زندگی کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس کی خرابیاں ہمارے لئے مفید تھیں۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ دلچسپی کا موضوع یہی ہو سکتا تھا کہ ملازمتوں میں جو تناسب مسلمانوں کا متعین تھا وہ اس سے محروم نہ رہنے چاہئیں۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد حالات یکسر بدل چکے ہیں۔ اب حکومت، ہماری اپنی ہے اور چونکہ حکومت کی مشینری کا انحصار اس کے دفاتری نظم و نسق پر ہے اس لئے اس کے اسقام و نقائص پر نگاہ رکھنا ازبس ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلوع اسلام نے اپنے دورِ جدید میں اس موضوع پر متعدد بار قلم اٹھایا ہے۔ بلکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس باب میں ہمیں جو کچھ کرنا چاہیئے تھا وہ ابھی تک ہم نہیں کر سکے۔ اس لئے آئندہ یہ مسئلہ ہماری توجہ کا زیادہ محتاج رہے گا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ دفاتری خرابیوں کے متعلق ہماری معلومات براہِ راست نہیں ہو سکتیں۔ لیکن حکومت کے مرکزی مقام پر ہونے کی وجہ سے ہماری معلومات بالواسطہ ہی سہی، ایسی غیر یقینی بھی نہیں ہو سکتیں کہ ان سے صحیح نتائج مرتب نہ کئے جا سکیں۔ حکومت کے دفاتری نظم و نسق کے متعلق جو کچھ ہمارے علم میں آ رہا ہے وہ نہایت دل خراش اور حوصلہ شکن ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء میں جس حالت میں حکومت کو اپنے ہاتھوں سے دیا تھا وہیں سے اب سلسلہ آگے چلایا ہے اور درمیانی نوے برس کا عرصہ (چونکہ عہدِ غلامی کا زمانہ تھا اس لئے اسے) اپنی کتابِ زندگی سے نکال دیا ہے۔ اس لئے بہ حیثیت مجموعی یوں سمجھئے کہ ۱۹۴۷ء نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء کا زمانہ ہے اور سکرات موت کی ہچکیاں لینے والے قلعہ دہلی یا دربارِ لکھنؤ کے جو افسانے سنتے چلے آ رہے تھے وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے حقیقت بن کر آ رہے ہیں۔

گذشتہ دو تین ماہ سے آپ برابر سنتے چلے آ رہے ہیں کہ حکومت کے دفاتر میں "ففتھ کالم" سرایت کر چکا ہے جو اپنی خفیہ تدابیر سے قصرِ حکومت کی تخریب میں مصروف ہے۔ محترم قائد اعظم، جناب وزیر اعظم اور وزیر مالیات محترم غلام محمد صاحب اور دیگر اربابِ بست و کشاد نے متعدد بار اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ یہ تخریبی قوتیں اندر ہی اندر ہمارے دفاتری نظام کو متاثر کر رہی ہیں۔ بالعموم یہ وہ لوگ ہیں جو حصولِ پاکستان سے پہلے نیشنلسٹ مسلمان کہلاتے تھے اور جنہوں نے اپنی تمام عمر، تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں گزار دی تھی۔ ہم نے اس سے پیشتر بھی لکھا تھا اور اسے پھر دہراتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے اربابِ حل و عقد نے بار بار کہا ہے اگر وہ حقیقت ہے اور اس کے حقیقت ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے، تو پھر حکومت نے اس خطرناک فتنہ کے استیصال کے لئے آج تک کیا عملی قدم اٹھایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم فقیر گوشہ نشین رموزِ مملکت سے واقف نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ تو ہر ایک

آنکھ دیکھ رہی ہے کہ اس وقت تک مرکزی حکومت کے دفاتر سے کسی ایک شخص کو بھی اس جرم کی پاداش میں الگ نہیں کیا گیا کہ وہ "نفقتہ کالم" سے متعلق ہے اور تخریبی سازشوں کا معاون۔ ان حالات کے پیشِ نظر ایک عام انسان بہرحال اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ

(۱) یا تو جو کچھ ان حضرات نے آج تک اس باب میں کیا ہے وہ غلط تھا۔

(۲) اور اگر وہ صحیح تھا تو اس فتنہ کے استیصال کے لئے کوئی عملی قدم نہ اٹھانا، تخریبِ پاکستان کے جرمِ عظیم کی کھلی ہوئی معاونت ہے جس کے مرتکب خود اربابِ حکومت ہو رہے ہیں۔

کیا ہم اتنا دریافت کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شقوں میں سے کونسی شق درست ہے!

وفاشعاری کے بعد دوسری چیز قابلیت ہوتی ہے۔ قابلیت کے اعتبار سے عملہ حکومت پاکستان کی عام طور پر کیا حالت ہے اس کے لئے ہم صرف اس ایک چٹھی کا ترجمہ شائع کر دینا کافی سمجھتے ہیں جو Truth کے نام سے ڈان مورخہ ۸ مئی ۴۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ وھو ہذا۔

"حکومت پاکستان نے تقسیم ہند سے پہلے تمام عملہ کو بلاتخصیص حقِ انتخاب دیدیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نالائق عملہ کا گروہ عظیم جو جنگ کے دوران میں بغیر کسی امتحان و معیار کے ملازم رکھ لیا گیا تھا۔ حکومت کے ساتھ آ گیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس عملہ کی تعداد، ضرورت سے زائد تھی اس لئے حکومت کے لئے موقع تھا کہ اس قسم کے نالائق عملہ کو چھانٹ کر الگ کر دیا جائے۔ اس باب میں حکومت نے گذشتہ دسمبر میں فیصلہ کیا کہ عارضی عملہ کا امتحان لے لیا جائے اور مستقل طور پر صرف اسے رکھا جائے جو اس امتحان کے معیار پر پورا اترے۔ نالائق عملہ جو جانتا تھا کہ امتحان کی حرارت ان کی قلعی کھول دے گی اس فیصلہ پر برافروختہ ہو گیا اس نے حکومت کو دھمکیاں دینی شروع کر دیں اور یا للعجب کہ حکومت ان گیدڑ بھبکیوں سے خائف ہو گئی اور اس نے اعلان کر دیا کہ نالائق عملہ کا امتحان نہ لیا جائے اور محکموں کو خود اختیار دیدیا جائے کہ وہ جسے قابل سمجھیں رکھ لیں۔

مئی ۱۹۴۷ء میں حکومت ہند نے عارضی عملہ کا امتحان لیا تھا جس میں اس عملہ سے جو پاکستان آیا ہے بیشتر حصہ شریک ہوا تھا۔ اس امتحان کے نتائج اب شائع ہو چکے ہیں اور حیرت ہے کہ اس عارضی عملہ میں سے جو اب یہاں ہے، صرف تیس کے قریب امیدوار کامیاب ہوئے ہیں۔ باقی تمام عملہ نے (جو شریک امتحان ہوا تھا) یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ قابلیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ لیکن یہی عملہ جس کی نااہلیت یوں مسلّم ہو چکی ہے اب مستقل طور پر حکومت کے دفاتر میں رکھا جا رہا ہے اور ان ہی سے آئندہ پچیس تیس سال تک حکومت کی مشینری چلائی جائے گی۔"

یہ حقائق کسی تبصرہ کے محتاج نہیں۔ جس حکومت کی یہ حالت ہو کہ وہ چند کلرکوں کی دھمکی پر اپنے فیصلوں کو منسوخ کر دے، اس حکومت کا اللہ حافظ۔ پھر اس غلط فیصلے سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ نالائق عملہ حکومت کی مشینری کا مستقل جزو بن گیا بلکہ یہ بھی کہ چونکہ انتخاب کے اختیارات دفاتر کے افسران کو دیدیئے گئے اس لئے وہ قابل طبقہ جو خوشامد اور چاپلوسی کی بنا پر نہیں بلکہ کام اور اہلیت کے بھروسے پر ملازمت کرنے کا عادی تھا، معتوب ہو گیا اور نالائق قرار دیدیا گیا۔

خود افسروں کا طبقہ بھی بیشتر نالائقوں پر مشتمل ہے۔ نہ صرف نالائق بلکہ بددیانت بھی۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جو ریٹائر ہونے کے بعد پھر مسندِ حکومت پر آ ڈٹے ہیں اور کچھ وہ جو ریٹائر ہونے کی حد تک پہنچ جانے کے باوجود توسیعِ ملازمت کی مراعات حاصل کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ابھی اگلے دنوں اسمبلی میں ایک سوال کے جواب میں وزیرِ اعظم صاحب نے فرمایا تھا کہ حکومت کی پالیسی اس کے خلاف ہے۔ یہ افسران عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکے ہیں جہاں نہ دماغی توازن قائم رہتا ہے نہ عملی قوتیں برقرار۔ دفتر آتے ہیں لیکن کام کی طرف سے بالکل پنشن یافتہ انہیں کچھ علم نہیں کہ ان کے ہاں کیا ہونا چاہیئے اور کیا ہو رہا ہے۔ افسر کیا۔ دستخط کرنے کی مشینیں ہیں۔ نہ جدتِ افکار نہ جوششِ کردار۔ ہر معاملہ میں یہ پوچھنے والے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں تاکہ وہی کچھ ہم کریں۔ اس باب میں ان افسران کے ایسے ایسے مضحکہ انگیز فیصلے اور حرکتیں سننے میں آتی ہیں جن پر عقل ہنستی ہے اور دل روتا ہے۔

افسروں میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو ہندوستان میں اول درجے کے نالائق شمار ہوتے تھے۔ ساری عمر ہندوؤں کی خوشامد میں گزر گئی محض ان کی خوشنودیٔ مزاج کی خاطر مسلمانوں کو گالیاں دینا اور ان کے مذہب، تہذیب، تمدن، سیاست کا مضحکہ اڑانا ان کا شعار تھا۔ چونکہ دماغ سے بالکل عاری ہوتے تھے اس لئے اکثر "بندوبست" کے کاموں میں لگا دیئے جاتے تھے۔ اسی "بندوبست" کے سلسلہ میں کسی کمیٹی یا کمیشن کے ساتھ ولایت چلے گئے۔ واپسی پر سمجھ لیا کہ خالص "صاحب زادے" ہیں۔ اب کسی کالے آدمی سے سیدھے منہ بات نہیں ہوتی۔ یہ عجیب الخلقت گروہ ہندوستان میں محض تفریح اور دلچسپی کا سامان ہوا کرتا تھا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ پاکستان بنا تو یہ صاحبِ اقتدار ہو گئے۔ زندگی بھر جو ہندوؤں کی لاتیں کھائی تھیں اب اس کا انتقام اپنے عملے کے خوددار افراد سے لینا شروع کر دیا۔ اب یہ قابل اور خوددار افراد ان کمینہ فطرت، برخود غلط، نالائق افسروں کے سفلہ پن کا شکار ہو رہے ہیں۔ اور کوئی سننے والا نہیں۔ نالائق ابھر رہے ہیں، اور قابل پستے ہیں۔ نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ نہ کہیں داد ہے نہ فریاد۔

اس سے آگے بڑھئے تو خویش نوازی اور اقرباپروری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچئے اگر کوئی شخص کسی سے سو روپے کی رشوت لے کر اسے ملازمت دلا دے تو حکومت کی اسپیشل پولیس کا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ جاتا ہے (اور پہنچنا بھی چاہیئے۔ بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ اس قسم کے گلے اس طرح گھونٹ دینے چاہئیں کہ یہ سانس لینے کے بھی قابل نہ رہیں)۔ لیکن اگر ایک شخص اپنے نالائق بھتیجے کو پانچسو روپے ماہوار کی ملازمت دیدیتا ہے (یا اپنے اثر سے دلا دیتا ہے) تو یہ کسی قانون کی گرفت میں نہیں آتا۔ حالانکہ ملت اور حکومت کو جس قدر نقصان یہ پہنچا رہا ہے، انفرادی رشوت لینے والا اتنا نہیں پہنچا رہا۔ لیکن ان اقربانوازیوں اور خویش پروریوں کی کوئی روک تھام نہیں۔ اور ابھی تو فاضل عملہ کی موجودگی کی وجہ سے ملازمتوں کے دروازے عام طور پر کھلے نہیں۔ ذرا نئی ملازمتوں کا سلسلہ شروع ہونے دیجئے پھر دیکھئے گا کہ اندھے کی ریوڑیاں کس طرح بٹتی ہیں۔

"فاضل عملہ" (Surplus Staff) کے ضمن میں یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ قریب ۹ ماہ ہونے کو آئے ابھی تک اس عملہ کے متعلق کوئی آخری فیصلہ نہیں ہو سکا۔ محترم عبدالرب صاحب نشتر

کے بیان کے بموجب (ڈان ۳۰ مئی) تقریب ۲۰ ہزار سے زائد عملہ نہبار ریلوے میں ہے۔ یہ عملہ برابر تنخواہیں پا رہا ہے اور ان کے لئے کام کوئی نہیں۔ غور کیجئے کہ کس قدر روپیہ بلا کام صرف ہو رہا ہے۔ اگر آپ تحقیق کریں گے تو اس باب میں بھی آپ کو نظر آئے گا کہ اس گتھی کے جلدی نہ سلجھنے کی بڑی وجہ حکومت کی مشنیری کی سست رفتاری اور افسران متعلقہ کی تساہل انگاری ہے۔ پھر یہی نہیں کہ زائد عملہ ہی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں ہونے پایا۔ ایسی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے افسر زائد از ضرورت بھی نہیں، بایں ہمہ انہیں کوئی کام نہیں دیا جاتا۔ بعضوں سے ان کی یہ حالت ہے کہ دفتر جاتے ہیں اور یہ دیکھ کر واپس آ جاتے ہیں کہ ابھی تک ان کی تعیناتی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ پھر ایسے لوگ بھی موجود ہیں کہ کام برابر کر رہے ہیں لیکن ان کی تنخواہ کے متعلق کچھ فیصلہ نہیں ہونے پاتا۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو بیس بیس سال کی مستقل ملازمت رکھتے ہیں لیکن انہیں کہہ دیا جاتا ہے کہ ان کی ضرورت نہیں۔ وہ بیچارے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کہیں شنوائی نہیں ہوتی۔ کسی کو معطل کر دیا جاتا ہے تو وہ مہینوں تک معلق ہی رہتا ہے۔ نہ اس کے خلاف فرد جرم مرتب ہوتی ہے نہ اسے بحال ہی کیا جاتا ہے۔ کسی کو بیٹھے بٹھائے تنزل کر دیا جاتا ہے اور کچھ نہیں بتایا جاتا کہ آخر کس جرم کی پاداش میں۔ نہ کسی قاعدے کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے نہ قانون کا التزام اندھیر نگری چوپٹ راجہ۔ یہ رو رہا ہے وہ چیخ رہا ہے۔ کوئی سننے والا نہیں کوئی دیکھنے والا نہیں۔ افسران بالا کو اپنے ذاتی مفاد کے تحفظ کی مہرہ بازیوں سے فرصت نہیں۔ افسران زیریں جو جی میں آئے کرتے ہیں ایک کے لئے ایک فیصلہ ہے دوسرے کیلئے دوسرا۔ جب حکومت کی مشنیری کی یہ حالت ہو تو اس سے جس قسم کے نتائج مرتب ہوں گے وہ ظاہر ہے! کاغذات بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح دن بھر گردش کرتے ہیں لیکن شام کو دیکھئے تو وہیں کے وہیں۔ کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا۔ کوئی اسکیم آگے نہیں بڑھتی! پبلک میں سے کسی بیچارے کا ذرا سا کام ان سے پڑ جائے تو پھر دیکھئے وہ بدبخت کس طرح خراب ہوتا ہے۔ حکام اور عملہ میں کوئی رابطہ نہیں۔ عملہ اور عوام میں کوئی ضابطہ نہیں۔ جو چند حساس افراد دیانتداری سے کام کر رہے ہیں وہ پس رہے ہیں۔ دوسرے ان کے خون اور پسینے کی قیمت پر مزے اڑا رہے ہیں اور نہیں سوچتے کہ جب کشتی ڈوبا کرتی ہے تو۔

نہ کہ را منزلت باشد نہ مہ را!

ہم نے سطور بالا میں، کہ جو فی الحقیقت جگر کے خون سے لکھی گئی ہیں، حالات کا صرف عمومی جائزہ ہے حالانکہ ہمارے پاس ان تصریحات کی تائید میں ٹھوس مثالیں موجود ہیں۔ سردست ہم عمداً [illegible] لینا چاہتے، لیکن اگر حالات کی اصلاح اس طرح سے نہ ہوئی تو ہمیں ان "قومی مجرموں" کے نقاب اتار دینے میں بھی باک نہیں ہوگا۔ ہم حکومت سے گذارش کریں گے کہ اگر وہ بھی ہم سے متفق ہیں کہ حالات فی الواقعہ اصلاح طلب ہیں تو اس کے لئے ہماری دانست میں ایک ہی تدبیر ہے کہ حکومت چند دیانتدار صاحب فکر و نظر، غیر سرکاری حضرات پر مشتمل ایک مجلس (کمیٹی) متعین کرے جسے اصلاح احوال کے

پورے پورے اختیارات حاصل ہوں۔ ان تک ہر شخص کی رسائی ہو اور وہ ہر مظلوم کی شکایت میں غیر جانبدارانہ تحقیق کرے۔ وہ موزوں حضرات سے شہادات لے کہ حکومت کی مشینری کے اسقام و نقائص کس طرح رفع ہو سکتے ہیں اور وہ کس نہج و اسلوب سے عمدہ نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ یہ مجلس نام نہاد نہیں پورے اختیارات کی حامل ہونی چاہیئے اور چپراسی سے لیکر وزیر تک ہر ایک اس کے حلقہ دار و گیر کے اندر محصور۔ اگر حکومت ہم سے تعاون چاہتی ہے تو ہم ایسے افراد کے نام بھی پیش کر سکتے ہیں جو ہماری دانست میں اس عظیم فریضہ کی سرانجام دہی کے اہل ہوں۔ اگر حکومت نے اس اہم فریضہ کی طرف جلد توجہ نہ کی تو ہمیں خدشہ ہے کہ موجودہ نظام خود اپنی اندرونی کمزوری ہی سے نیچے آ گرے گا اور پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھل سکے گا۔ کیونکہ یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

(۲)

تصوف کی کتابوں میں ایک قصہ پڑھا کرتے تھے کہ کسی بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ ایک مرد خضر صورت آئے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں کہ غفلت میں کیوں پڑے ہو۔ اٹھو! اس مرتبہ کا حج، حج اکبر ہے۔ اس ثواب سے محروم مت رہو۔ اس بزرگ نے اس مرد درویش کا شکریہ ادا کیا اور اٹھ کر اپنے سفر حج کا اعلان کر دیا۔ اعلان سنکر ان کے ہزارہا مریدان کی معیت میں حج کے لئے تیار ہو گئے۔ اس بزرگ کے مرشد کو معلوم ہوا تو انہوں نے پوچھا کہ حج کو جانے کا فیصلہ کیسے کیا گیا۔ اس بزرگ نے اپنا خواب بیان کیا تو مرشد نے فرمایا کہ کچھ معلوم بھی ہے وہ مرد درویش صورت کون تھا؟ وہ ابلیس تھا۔

"ابلیس؟ وہ حضور! اس کا کلام تو نیک باتوں سے بچا رہا ہے۔ اس نے مجھے خواب غفلت سے جگا کر حج کے لئے آمادہ کیوں کر دیا!"

"تم نہیں جانتے" مرشد نے جواب دیا "خلیفۂ وقت نے جہاد کا اعلان کیا ہے۔ شیطان چاہتا ہے کہ تم اور تمہارے مریدوں کی جماعت عظیم اس میں شریک نہ ہو سکیں۔ تمہیں اس سے باز رکھنے کا یہی طریق ہو سکتا تھا کہ تمہاری توجہ حج اکبر کے ثواب کی طرف منعطف کرا دی جائے۔ تم شیطان کے ان مقدس فریبوں سے واقف نہیں ہو۔"

پاکستان موت و زیست کے جس دور سے گزر رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دشمن ہر وقت اس فکر میں ہے کہ اس نوزائیدہ مملکت کو پروان چڑھنے سے پہلے ہی پامال کر دیا جائے۔ لہٰذا وقت کا تقاضا ہے کہ ہر پاکستانی مسلمان اس کے استحکام و بقا کے لئے اپنی پوری پوری کوشش صرف کر دے۔ لیکن بعض قوتیں ایسی ہیں جو "حج اکبر" کے ثواب کے مقدس نقاب میں مسلمانوں کو فرعی اور نظری مباحث میں الجھائے رکھنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ آج کل پنجاب میں یہ اہم بحث مسلمانوں کی توجہات کا مرکز بنی ہوئی ہے کہ اسلام میں پردے کی کیا حیثیت ہے۔ یہ بحث بڑی شد و مد سے

سامنے لائی جاتی ہے اور پھر موافق و مخالف فریقوں میں جنگ و جدل کا دروازہ کھول کر انہیں باہم گر لڑایا جاتا ہے۔ چنانچہ سنا ہے کہ اسی ثواب لوٹنے والے گروہ کا ایک متشدد مذہب پرست قینچی ہاتھ میں لیکر باہر آگیا اور دو چار بے پردہ عورتوں کی چٹیا کاٹ ڈالی۔ انہوں نے غالباً پولیس کی امداد طلب کی اور اب شاید معاملہ عدالت تک پہنچ رہا ہے۔ اگر ان حضرات سے پوچھو تو یہ کہہ دیں گے کہ شریعت حقہ کے اہم مباحث ہیں۔ قوم مغربی تہذیب کے سیلاب میں بہے جا رہی ہے۔ اس کی روک تھام کرنا بیحد ضروری ہے۔

کوئی ان اجارہ داران شریعت سے پوچھے کہ ابھی کل کا ذکر ہے کہ تمہاری لاکھوں مستورات بلکہ کی مائیں، بہنیں، بچیاں، تمہاری عزت و ناموس کی سرمایہ دار، تمہاری غیرت و حمیت کی متاعیں۔ وحشی درندوں نے اچک لیں۔ ان کے برہنہ جلوس نکالے گئے۔ ان کی بے حرمتی میں سبعیت و بہیمیت کا کوئی انداز باقی نہ چھوڑا گیا۔ اور اسی تک قریب پچاس ہزار خواتین ان کے قبضہ میں ہیں۔ کیا تمہاری شریعت میں ان مسائل کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کیا تم نے اس کا پورا پورا انتظام کر لیا ہے کہ آئندہ ان ناشدنی واقعات کا اعادہ نہ ہونے پائے گا؟ کیا تم نے کشمیر کی سرحدوں پر پھرنے والے ڈوگروں اور سکھوں کی وحشت آلود آنکھوں کا کچھ مداوا سوچ رکھا ہے؟ کیا تم نے ان خطرات کا مقابلہ کرنے کی پیش بندی پوری تدبیر کر رکھی ہیں جواب فارغ ہو کر ان معاشرتی مسائل کے حل میں مصروف ہو رہے ہو؟ کیا تم نے زمین کے ان تمام ہنگاموں "سے فرصت پا لی ہے عواقب آسمان" کی فکر تمہیں اس طرح ستا رہی ہے۔ خدا کے لئے سوچو کہ قوم کے سر پر کن مصائب و نوازل کے بادل منڈلا رہے ہیں اور تم انہیں کن مباحث میں الجھا رکھنا چاہتے ہو؟۔

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہو گا
مسائل نظری میں الجھ گیا ہے خطیب

اس میں کسے کلام ہے کہ اسلام کے معاشرتی نظام میں ان مسائل کو خاص اہمیت حاصل ہے اور ان کے متعلق ہر صاحب فکر و نظر کو سوچنا ہو گا، لیکن اتنا تو سوچو کہ ان کے حل کرنے کا یہ کون سا وقت ہے؟ تاریخ میں پڑھا کرتے تھے کہ مسلمانوں کی فوجیں قسطنطنیہ کے دروازے پر جا پہنچیں لیکن شہر کے اندر مسیحی علماء اس بحث میں مصروف مجادلہ تھے کہ حضرت عیسےٰ نے عشاء ربانی میں فطیری روٹی کھائی تھی یا خمیری۔ پاکستان کے مسلمانوں کو بھی آج اسی قسم کے مسائل میں الجھایا جا رہا ہے۔ ہم اپنے بھائیوں کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ۔ حج اکبر کے ثواب کا لالچ دینے والے بزرگوں کے مقدس فریب کا دھوکہ نہ کھائیں۔ یہ تمہارے جان و مال کے دشمن ہیں۔ عزت و آبرو کے دشمن ہیں۔ ملت و مملکت کے دشمن ہیں ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ اس وقت تمہاری تمام قوتیں اس امر میں صرف ہو جانی چاہئیں کہ پاکستان میں کوئی اندرونی خلفشار نہ ہونے پائے۔ کشمیر ہاتھ سے نہ جانے پائے اور آگے بڑھے تو فلسطین میں غیر اسلامی اقتدار قدم نہ جمانے پائے۔ یہ معاشرتی مسائل تمہارے آئندہ دستور و آئین کی فروعات ہیں۔ اس آئین کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک مرکزی مجلس متشکل ہو چکی ہے۔ کوشش کرو کہ وہ مجلس بہت جلد اپنا کام سرانجام دے اور جو آئین وضع کرے

وہ اسلامی خطوط پر متشکل ہو۔ اس اصل کو سنبھال لیجئے تو تمام فروعات خودبخود سنبھل جائیں گی۔ اصل کو چھوڑ کر فروعات کے پیچھے پڑ جانا جڑ کو کاٹ کر پتوں پر پانی چھڑکنے کے مرادف ہوتا ہے۔ اس مقدس فریب کو مت پاس آنے دو انہ لکم عدو مبین جو شخص تمہیں ان فرعی مباحث میں الجھانا چاہے اسے کہہ دیجئے کہ اس سوال کو مجلس آئین ساز تک پہنچا دیجئے اور کوشش کیجئے کہ یہ وہاں سے قانون بن کر نافذ ہو جائے۔ جب یہ چیز قانون بن جائے گی تو ہر ایک اس کی اتباع پر مجبور ہو جائے گا۔ ورنہ اگر تم ان فروعات کے پیچھے انفرادی طور پر پڑے رہے اور تمہاری اس باہمی جنگ و جدل میں وہ قوت ہی کمزور ہو گئی جو ان مسائل کو قانون بنا کر نافذ کرنے کے لئے حاصل کی گئی ہے تو تمہاری اس اصلاح سے کیا فائدہ ہو گا! اس قسم کے ناصحین بڑے معصومانہ انداز میں اپنے آپ کو مصلحین بنا کر پیش کیا کرتے ہیں۔ یاد رکھو یہ مفسدین ہیں۔ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ

---

(۳)

مغربی پنجاب کی حکومت کے "محکمہ تشکیل اسلامیات" میں ایک "شعبہ تحقیقات" قائم کیا جا رہا ہے۔ یہ شعبہ، محکمہ تشکیل اسلامیات کے ڈائرکٹر مسٹر اسد اور ان کے مستقل عملے کے علاوہ مختلف الخیال علماء پر مشتمل ہو گا۔ اس کا کام یہ ہو گا کہ وہ تحقیق کرے کہ اہم معاشرتی و معاشی مسائل بشمل حرمتِ سود، اصلاحِ زراعت بیمۂ زندگی، سرمایہ اور مزدور کے تعلقات وغیرہ کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے۔ یہ شعبہ اپنی تحقیقات کے آخری منازل میں ماہرین معاشیات کی امداد بھی حاصل کرے گا۔ (بحوالہ ڈان ۱۱ ۵/۴۸)۔ پنجاب کے محکمہ تشکیل اسلامیات کا تذکرہ، سابقہ اشاعت میں ضمناً اور تبعاً آیا تھا جبکہ ہم نے اس کے ڈائرکٹر مسٹر اسد کے مقالہ "اسلامی آئین سازی" پر تبصرہ کیا تھا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے متعلق کچھ مزید تصریحات کی ضرورت ہے۔

ہم حکومت پنجاب کے اس اقدام (یعنی محکمہ تشکیل اسلامیات کے قیام) کی تہہ تک ہی نہیں سمجھ سکے۔ جب تک ملک میں غیروں کا قانون رائج تھا، مسلمانوں کے لئے دین، مذہب کی حیثیت رکھتا تھا۔ مذہب کے لئے کچھ اصلاحات (وعظ و نصیحت اور فتاویٰ وغیرہ) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں کسی ایک صوبہ میں تو ایک طرف، ایک ایک گاؤں اور ایک ایک قریہ میں اس قسم کے اداروں کے قیام کی علت قابلِ فہم تھی۔ یہ وہ ادارے تھے جو اپنے طور پر مذہبی مسائل کی تحقیقات کرتے۔ لوگوں میں مذہب کا شوق پیدا کرتے۔ وعظ و تبلیغ سے عوام کو مذہب پرست بناتے۔ ان کی غلط رسوم کی اصلاح کرتے جب وہ مذہبی امور میں مسئلہ پوچھنے کو آتے تو ان کے لئے فتاویٰ لکھتے۔ وقس علیٰ ذلک۔ قیام پاکستان کے بعد، صورتِ حالات یکسر بدل چکی ہے۔ اب مسلمان ایک آزاد قوم ہے جس کا بنیادی نصب العین یہ ہے کہ اس مملکت میں شریعت کا قانون نافذ ہو گا۔ یعنی اب یہاں شریعت کے احکام بطور قانون کے نافذ کئے جائیں گے۔ لہٰذا اب کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ حکومت وہ ضابطۂ قوانین مرتب کرے

جسے اسلامی نظام کہا جاسکے۔ اس ضابطہ کو ملک میں بطور قانون حکومت نافذ کر دیا جائے۔ اس کے لئے حکومت کی طرف سے قاضی مقرر ہوں۔ مفتی ہوں، مشیر ہوں۔ حکومت ہی کے محکمۂ قوانین سنا میں تحقیقاتی ادارے ہوں۔ اور یہ سب کام مرکز کے کرنے کا ہے۔ اس لئے کہ سارے ملک کے لئے بنیادی قانون تو مرکز ہی کی طرف سے نافذ ہوگا۔ اس بنیادی قانون میں جس حد تک صوبوں کو اختیارات تفویض کئے جائیں گے، وہاں تک قانون کی تنفیذ کی ذمہ داری صوبوں پر ہوگی۔ ان حالات کی روشنی میں پاکستان کے کسی ایک صوبہ میں، تشکیلِ اسلامیات، کے لئے کسی محکمہ کا قیام چہ معنیٰ دارد! کیا پنجاب اپنے لئے کوئی جداگانہ قانون شریعت بنانا چاہتا ہے۔ اور اگر پنجاب ایسا کرسکتا ہے تو پاکستان کے باقی صوبے بھی اپنی اپنی جگہ اسی قسم کے ضوابط قانون بنا سکتے ہیں۔ پھر مرکزی نظام قانون کہاں نافذ ہوگا اور اس کی ترتیب و تدوین کس مقصد کے ماتحت عمل میں آئیگی! اور اگر مرکزی قانون ملک میں رائج نہیں ہوگا تو مرکزی مجلس دستور ساز، جو صوبوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے، کس مقصد کے لئے عمل میں لائی گئی ہے! یہ وہ سوالات ہیں جو اس اقدام سے فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں جو پنجاب عمل میں لایا ہے۔ مثلاً فرض کیجئے کہ پنجاب کے محکمۂ تشکیل اسلامیات نے بعد از تحقیق یہ فیصلہ کیا کہ زندگی کا بیمہ مسلمانوں کے لئے ناجائز ہے تو اس کے بعد کیا ہوگا۔؟

(۱) اگر یہ ان کا کچی فیصلہ ہوگا تو یہ تحقیق محض نظری تحقیق ہوگی جس کی اہمیت کچھ نہیں۔ اس وقت بھی بعض لوگ یہ مانتے ہیں کہ زندگی کا بیمہ ناجائز ہے اور بعض لوگ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ اس وقت بھی کچھ لوگ محکمہ تشکیل اسلامیات کی اس تحقیق سے متفق ہوں گے کچھ مخالف۔

(۲) اگر اس تحقیق کے نتیجہ کو حکومت پنجاب نے بطور قانون اختیار کر لیا تو کیا یہ قانون محض صوبہ پنجاب تک محدود ہوگا۔ لامحالہ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ کسی صوبہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنا کوئی قانون صوبہ کے باہر بھی نافذ کر سکے۔

(۳) اگر پنجاب کے تحقیقاتی ادارہ نے یہ فیصلہ کیا اور اسی قسم کے تحقیقاتی ادارے نے جو بنگال میں قائم کیا جائے اس سے مختلف فیصلہ دیا تو پنجاب کے مسلمانوں پر ایک قانون نافذ ہوگا اور بنگال کے مسلمانوں پر دوسرا۔

(۴) اور اگر کل کو مرکز نے اپنے نظامِ قوانین میں ایسی شق رکھدی جو اس باب میں پنجاب کے فیصلہ سے مختلف ہو۔ تو اس صورت میں پنجاب میں کونسا قانون نافذ ہوگا۔ مرکز کا یا صوبہ کا؟

(۵) اگر مرکز کا قانون نافذ ہوگا تو پھر اس صوبائی تحقیقات کے معنی کیا ہیں اور اگر صوبائی قانون نافذ رہے گا تو پھر مرکز میں آئین سازی کی کوششیں کس کے لئے ہیں؟

جوف نے باکانہ کی گستاخی کی معذرت کے ساتھ، ہم تو اتنا ہی سمجھ سکے ہیں کہ حصول پاکستان کے بعد مسلمانوں کی طرف سے قوانین شریعت کے نفاذ کا جو عالمگیر مطالبہ شروع ہوا ہے اس رَو کی روک تھام کے لئے مختلف لطائف

کی حسین کوششیں کی گئی ہیں۔ پنجاب کا تشکیلِ اسلامیات کا محکمہ بھی، ہمیں تو اسی قبیل سے دکھائی دیتا ہے اس کا قیام ایسا ہی ہے جیسے انگریزی نظام میں اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ کالج بنا دیئے جاتے تھے۔ ان اسکولوں اور کالجوں میں نصابِ تعلیم یکسر وہی ہوتا تھا جو دوسرے مدارس میں، صرف ایک پیریڈ تعلیمِ قرآن یا دینیات کے لئے الگ کر دیا جاتا تھا۔ عوام خوش ہو جاتے تھے کہ ہماری مذہبی تعلیم کا انتظام ہو گیا۔ پنجاب کی حکومت ابھی تک اسی ڈھب کی ہے جیسے انگریز کے نظام میں ہوتی تھی۔ بس اس میں تعلیمِ دینیات کے ایک پیریڈ کا اضافہ "محکمہ تشکیلِ اسلامیات" کے نام سے کر دیا گیا ہے۔ اب عوام خوش ہیں کہ ہماری حکومت نے دین کا محکمہ مقرر کر دیا ہے۔ یہ وہی "چاند تارا" ہے جس سے آج ہماری ہر غیر اسلامی ادا عین اسلامی بن جاتی ہے۔ کتنا بڑا کھیل ہے جو سادہ لوح عوام سے کھیلا جا رہا ہے۔ نہیں! خدا سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے رسولؐ سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے دین سے کھیلا جا رہا ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں

(۱) حکومتِ پنجاب کے ان عناصر سے جو اس محکمہ تشکیلِ اسلامیات کے قیام کے ذمہ دار ہیں کہ اگر ان کا فی الواقعہ اس پر ایمان ہے کہ اسلام کے احیاء کی ضرورت ہے تو انہوں نے اس وقت تک اپنی زندگیوں کو اور اپنے نظامِ حکومت کو کس حد تک اس قالب میں ڈھالا ہے۔

(۲) اور خود محکمہ تشکیلِ اسلامیات کے اربابِ حل و عقد سے کہ آپ کے محکمہ کی تحقیقات اور فیصلے کس حد تک حکومتِ پنجاب کے غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں بدلنے میں کامیاب ہوئے ہیں؟

اور اگر حقیقت یہ ہے کہ نہ اول الذکر میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے اور نہ آخر الذکر کے فیصلے حکومتِ پنجاب کے نظام کو متاثر کر سکتے ہیں تو پھر کیا یہ وہی چیز تو نہیں ہو رہی ہے جسے کھشتری اور برہمن کی ملی بھگت کہا جاتا ہے یعنی حکومت اس محکمہ کی کفالت کر رہی ہے اور یہ محکمہ حکومت کے لئے سپر کا کام دے رہا ہے۔

ہم نے یہ تصریحات کھلے کھلے الفاظ میں بیان کر دی ہیں تاکہ اگر ہم نے کہیں بات سمجھنے میں غلطی کی ہے تو اس کی اصلاح کر دی جائے۔ اور اگر بات واقعی وہی ہے جو ہم نے سمجھی ہے تو کم از کم مسٹر اسد (جو اس محکمہ کے ڈائرکٹر ہیں اور جن کے خلوص کے متعلق ہمارے بعض کرم فرماؤں نے شہادت دی ہے) اس کا فیصلہ کر سکیں کہ وہ کہیں نادانستہ ایک کوشش رائگاں (اور ایک حیثیت سے زبوں حاصل) کے معاون تو نہیں بن رہے؟

سابقہ اشاعت میں ہم نے تحریک کی تھی کہ قوم کے قائدین (بالخصوص محترم قائدِ اعظم) کو چاہیئے کہ وہ پاکستان کے ساختہ کپڑے کا استعمال شروع کر دیں تاکہ ملک میں کپڑے کی کمی پوری ہو جائے اور بہت سے بیکار افراد کے معاش کا انتظام ہو جائے۔ ہمیں خوشی ہوئی کہ ہماری یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی اور کراچی کی دنیا میں اس باب میں کچھ تحرک پیدا ہوا ہے جس سے پاکستانی ملبوسات کے استعمال کا چرچا شروع ہو گیا ہے۔ لیکن جس انداز سے اس تحریک کو چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ پھر ان ہی فرسودہ اور پامال ابواب کا مرقع ہے جو ہمارے فکری تعطل کی علامت بن گئی ہیں، یعنی لوگوں سے اقرار نامے لکھوائے جاتے ہیں کہ وہ پاکستانی کپڑا پہنیں گے۔ ہمارے خیال میں اس قول و اقرار کی ضرورت نہیں۔ ضرورت وہی ہے جس کا ہم نے

سابقہ اشاعت میں ذکر کیا ہے۔ یہ حضرات اپنے بدیشی سوٹوں کو الگ کر دیں اور پاکستان کا بنا ہوا موٹا جھوٹا کپڑا زیب تن فرما کر لوگوں میں چلنا پھرنا شروع کر دیں۔ پھر دیکھیں، کس طرح ہر پیکر، بلا حلف دیجان، میدانِ پاکستان، بن جاتا ہے اور دوسری طرف پارچہ بافی کی دستکاری کے لئے حکومت کی طرف سے مراعات دینی شروع کر دی جائیں۔ اس سے آگے بڑھیں تو سرکاری ملازمین پر پابندی عائد کر دیں کہ وہ کوئی نیا کپڑا غیر پاکستانی نہیں بنوائیں گے!

یاد رکھئے۔ عملی مثال سے بڑھ کر کوئی لکچر مؤثر نہیں ہوا کرتا۔

---

(۵)

ہمیں براہِ راست تو کوئی اطلاع ملی نہیں لیکن ایسوسی ایٹڈ پریس کی اطلاع مظہر ہے کہ حکومت یو۔پی نے اپنے صوبہ میں طلوعِ اسلام کا داخلہ قانوناً ممنوع قرار دیدیا ہے۔

ایک دفعہ ہمارے ایک ملنے والے کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے یکایک انتقال ہو گیا۔ ہم نے ڈاکٹر سے استعجاباً کہا کہ انسان کی موت بھی کیسی حیرت انگیز شے ہے۔ ابھی یہ بھلے چنگے تھے۔ ابھی ختم ہو گئے ڈاکٹر نے کہا انسان کی موت حیرت انگیز نہیں۔ حیرت انگیز تو یہ امر ہے کہ یہ زندہ کس طرح سے رہتا ہے!

ہمیں حیرت اس پر نہیں ہوئی کہ حکومت یو۔پی نے طلوعِ اسلام کا داخلہ ممنوع کیوں قرار دیدیا۔ حیرت اس پر تھی کہ اتنا عرصہ طلوعِ اسلام کو یہ اجازت کس طرح دی گئی کہ وہ حکومتِ ہند کے مسلمانوں تک پہنچ جایا کرے! ہماری یہ آواز ہمارے ان بھائیوں تک کس طرح پہنچ سکے گی جن سے ہمارے قلبی رابطہ کا محسوس ذریعہ طلوعِ اسلام تھا۔ لیکن اگر کسی طرح ان تک یہ آواز پہنچ جائے تو ہم ان سے عرض کریں گے کہ وہ گھبرائیں نہیں۔

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

مستبد حکومتیں دنیا میں زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا کرتیں۔ والظالمون مالھم من ولی ولا نصیر

---

(۶)

اس وقت ارضِ فلسطین مسلمانانِ عالم کی توجہات کا مرکز بن رہی ہے۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کے سامنے اس ارضِ مقدس اور اس سے متعلقہ مباحث سے متعلق معلومات کی اتنی کمی ہے کہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ فلسطین کی تاریخ کیا ہے، اس کا جغرافیہ کیا۔ عربوں کے مطالبات کیا ہیں اور ان کی نوعیت کیا۔ غیر مسلم قوتوں کے عزائم کیا ہیں اور ان کی علت کیا۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے، طلوعِ اسلام کی اشاعت رواں میں فلسطین سے متعلق ایک مبسوط مقالہ شائع کیا جا رہا ہے جو بوجوہ گہرے مطالعہ کا مستحق ہے۔ طلوعِ اسلام کا اپنے متعلق آپ ہی خود کہنا غیر موزوں سا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس مقالہ سے آپ خود اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہمارے لٹریچر میں اس قسم کی چیزیں کمیاب ہی نہیں نایاب ہیں اور ان کی ضرورت اشد۔ خدا طلوعِ اسلام کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اس قسم کی کمی کو پورا کرتا رہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

اشاعت رواں میں "اسلامی نظام" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب کا نہایت بلیغ اور محققانہ مقالہ شائع ہو رہا تھا جس کی کاپیاں بھی پریس میں جا چکی تھیں۔ لیکن فلسطین سے متعلق مضمون اتنا طویل ہو گیا کہ ان دونوں میں سے ایک مضمون ہی ماہ رواں میں شائع ہو سکتا تھا۔ موقعہ کی اہمیت کے اعتبار سے فلسطین سے متعلق مضمون تمام و کمال شائع ہو رہا ہے اور محترم پرویز صاحب کا مقالہ آئندہ ماہ پر اٹھا رکھنا پڑا ہے۔ اگرچہ ہمیں اس کا بیحد افسوس ہے لیکن اس مجبوری کا کیا علاج کہ بازار سے کاغذ ہی دستیاب نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود کیفیت یہ ہے کہ ہر ماہ رسالہ اپنی اوسط ضخامت سے ایک آدھ جزو بڑھ جاتا ہے سنتے ہیں کہ۔

گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے۔

دیکھئے اس علاج کے لئے ہماری باری کب آتی ہے۔

پاکستان کی مجلس دستور ساز نے فیصلہ کر دیا ہے کہ مرکزی حکومت کا دار السلطنت کراچی ہو گا۔ اس شہر کو حکومت سندھ سے لے لیا جائے گا اور اس کے انتظامات مرکز کی تحویل میں دیدیئے جائیں گے۔

کراچی کو مرکزی حکومت کے دارالسلطنت بنانے کا سوال کچھ عرصہ سے زیر بحث تھا۔ چنانچہ سندھ مقننہ کے گذشتہ اجلاس میں یہ سوال خاص طور پر مرکز توجہ رہا اور سندھ کے ارباب حل و عقد نے اس باب میں بڑی بدسلیقگی اور کم ظرفی کا ثبوت دیا۔ اس کے متعلق ہم مارچ کی اشاعت میں تفصیلی طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ مرکزی حکومت کے لئے ایک دار السلطنت کی ضرورت تھی اور جس مقام کو بھی اس مقصد کے لئے موزوں سمجھا جاتا اس کا مرکز کی تحویل میں آنا ناگزیر تھا۔ اگر حکومت نے اپنے مقاصد و مصالح کے پیش نظر اس غرض کے لئے کراچی کو تجویز کیا ہے (حالانکہ ہمارے نزدیک مرکزی حکومت کا دار السلطنت اندرونِ پنجاب، یعنی کہیں راولپنڈی کے قریب ہوتا تو زیادہ موزوں تھا) تو کراچی کا صوبہ سندھ کی تحویل میں رہنا بے معنی تھا۔ اس اعتبار سے اس فیصلہ کے خلاف اعتراض کی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن مجلس دستور ساز میں مسٹر کھوڑو اور مسٹر گزدر کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی اور ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ وہ اس مخالفت کے جواز میں کوئی معقول دلیل پیش نہ کر سکے۔

اس کے باوجود کہ ہم اصولی طور پر مرکزی حکومت کو اس فیصلہ کیلئے حق بجانب سمجھتے ہیں، ہمارا خیال ہے کہ اس فیصلہ کیلئے موجودہ وقت بہت ناموزوں اور اس کیلئے حالات سخت ناساعد تھے۔ مسٹر کھوڑو نے اپنے زمانہ وزارت عظمیٰ میں تمام صوبہ میں سندھی اور غیر سندھی کا جو زہر پھیلایا ہے اس کے اثرات بہت دور تک پھیل چکے ہیں۔ اور یہی وہ زہر ہے جو باہر سے آنے والے پناہ گزینوں کے سندھ میں بعافیت بسنے کے راستہ میں سنگ گراں بن کر حائل ہو رہا ہے۔ خدا خدا کر کے مسٹر کھوڑو کو اس پوزیشن سے الگ کیا گیا اور اب کچھ توقع کی جا سکتی تھی کہ پناہ گزینوں کے لئے حالات سازگار ہو سکیں گے۔ لیکن عین اس وقت مرکزی حکومت نے کراچی کی علیحدگی کا فیصلہ کر کے مسٹر کھوڑو اور اس کے رفقاء کو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کی بازیابی کا موقع بہم پہنچا دیا۔ اب یہ شخص اسی فتنہ خوابیدہ کو پھر سے ہوا دے گا۔ اور زور و شور سے اس کا پروپیگنڈا کیا جائیگا کہ کھوڑو کے خلاف تمام بدعنوانیوں کے الزامات اس لئے عائد کئے جاتے تھے کہ وہ کراچی کو مرکزی حکومت کے سپرد کرنے پر تیار نہ تھا۔ یہی اس کا وہ جرم تھا جس کی پاداش میں اسے اس قدر سخت سزا دی گئی۔ اس شخص نے یہ سب کچھ قبول کیا لیکن اپنی قوم سے غداری نہیں کی اور کراچی کو غیر سندھیوں کے ہاتھوں فروخت نہیں ہونے دیا۔ نئی وزارت نے مرکزی حکومت سے یہ سودا کر لیا اور کراچی کو بیچ دیا۔ وغیرہ۔ سندھ جہلا کا ملک اور بدترین صوبائی تعصب کا مرکز ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ مسٹر کھوڑو اب سندھیوں کے ہیرو بن جائیں گے۔ اور تمام سندھ میں فتنہ کی آگ بھڑکا دیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ مرکزی حکومت اس فتنہ کی آگ کو زیادہ مشتعل نہ ہونے دے۔ لیکن اس سے ایک خلفشار اور انتشار تو پیدا ہو جائے گا، جس کا کچھ اور نتیجہ ہو یا نہ ہو۔ کچھ وقت کے لئے پناہ گزینوں پر مصیبتیں ضرور آ جائیں گی۔ اندرونِ سندھ میں جس قدر پناہ گزین آباد ہیں، سندھی جہلا پہلے ہی انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ اب جو اس سوال پر سندھی اور غیر سندھی کے فتنہ کو از سرِ نو ہوا دی گئی تو ان بیچاروں کیلئے نئی نئی مصیبتوں کا سامان پیدا ہو جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر مرکزی حکومت یہی فیصلہ چار چھ مہینے کے بعد کرتی جب حالات زیادہ سازگار ہو جاتے تو زیادہ موزوں تھا۔ اب یہ فیصلہ کر دیا گیا ہے تو ضروری ہے کہ اس کے عواقب کا پہلے سد باب کیا جائے۔ ممکن ہے مرکزی حکومت یہ کہے کہ حالات ایسے پیدا ہو چکے تھے کہ اس فیصلہ میں تاخیر مصلحت رساں تھی۔ اگر یہی صورت ہے تو حکومت کو چاہیئے کہ وہ ان حالات کو ملت کے سامنے پیش کر دے تاکہ اس اٹھنے والے فتنہ کا انسداد ہو جائے۔ مشکل یہ ہے (اور اس کا ہم کئی مرتبہ ذکر کر چکے ہیں) کہ حکومت ابھی تک اپنے میں اور عوام میں کوئی رابطہ پیدا نہیں کر سکی۔ وہ اپنے فیصلوں میں عوام کا اعتماد حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔ وہ اپنے فیصلوں کے جواز میں صرف اتنا کہہ دینا کافی سمجھتی ہے کہ "رموز مملکت خویش خسرواں دانند"۔ لیکن ہم حکومت سے ایک مرتبہ پھر عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جمہوریت کے اس دور میں صرف یہ دلیل، عوام کے اطمینان کا باعث نہیں ہو سکتی۔ حکومت کو چاہیئے کہ اس مسئلہ میں ان تمام مصالح و مقتضیات کو ملت کے سامنے پیش کر دے جو اس فیصلہ میں عجلت کا موجب بنے۔ تاکہ عوام شورش پسند اور فتنہ پرور

حقائق وعبر

علمائے عظام ــــــــــــ جمعیت العلمائے ہند نے اخیر اپریل میں اپنا اجلاس بمبئی میں منعقد کیا۔ صدر جلسہ، شیخ الحدیث، جناب حسین احمد صاحب مدنی تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا۔

> ہندوستان کی تاریخ میں، مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کے اسمائے گرامی سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ یہ حضرات مسلمانانِ ہند کے سب سے بڑے دوست ہیں
>
> (ہندوستان ٹائمز بمبئی ۲۰)

ان ہی شیخ الحدیث صاحب نے ۱۹۳۸ء میں، مرحوم شوکت علی صاحب کو ایک خط لکھا تھا جس میں ارشاد تھا۔

> جو مظالم آئے دن دفتروں میں، شہروں میں اور ریاستوں میں کئے جارہے ہیں اور جس تعصب اور عدم رواداری کا ثبوت "ہندو دیوتا" گاندھی جی اور نہرو صاحب نے دیا ہے ان کی بنا پر ہم کسی طرح بھی اپنے ابنائے وطن کے ساتھ متحدہ قومیت کی توقع نہیں کر سکتے۔

یہی گاندھی جی اور نہرو صاحب آج مسلمانوں کے سب سے بڑے دوست قرار دیئے جارہے ہیں! کیا ان تمام مظالم اور تعصبات کے باوجود جو ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک ان کی طرف سے مسلمانوں پر روا رکھے گئے ہیں۔

> آگے چل کر اپنے خطبۂ صدارت میں، جناب شیخ الحدیث صاحب فرماتے ہیں
>
> تقسیم ہند کے ساتھ ہی مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ پاکستان کے مفاد بھی تقسیم ہو گئے ہیں۔

ہمارا فریضہ اب یہی ہے کہ ہم مسلمانان ہند کے مفاد کا تحفظ کریں نہ کہ ان مسلمانوں کے مفاد کا جو سرحد ہند کے اس پار، پاکستان میں بستے ہیں۔ اگر کبھی ہندوستان اور پاکستان میں شدید قسم کے اختلافات رونما ہو گئے تو ہمارا مسلک ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کی روشنی میں متعین ہوگا نہ کہ پاکستان کے مسلمانوں کے مفاد کے پیش نظر وہ اپنے مفاد کی حفاظت آپ کر سکتے ہیں۔ (الفضل)

یہ اپریل ۱۹۴۸ء کا ارشاد ہے۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں اسی جمعیت کے اجلاس (منعقدہ لاہور) کی صدارت ان ہی شیخ الحدیث صاحب نے فرمائی تھی جس میں ایک ریزولیوشن یہ بھی پاس کیا گیا تھا کہ جمعیت، عراق، شام، فلسطین، ایران وغیرہ اسلامی ممالک پر کسی غیر مسلم قوت کا غلبہ و استیلاء کسی حالت میں بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ اس ریزولیشن کی تائید میں، جناب احمد سعید صاحب نے فرمایا تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان اسلامی اخوت کے رشتہ میں منسلک ہیں۔

اُس وقت یہ کیفیت تھی اور آج حالت یہ ہے کہ یہ حضرات پاکستان کے مسلمانوں سے اس طرح قطع علائق اور بیزاری کا اظہار فرما رہے ہیں۔ اور اعلان کر رہے ہیں کہ اگر کل کو ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی تو ان حضرات کی تلوار ہو گی اور مسلمانان پاکستان کی گردن۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہمیں آئے دن نمبروں سے قرآن اور احادیث کے حوالوں سے یہ وعظ سنایا کرتے ہیں کہ

پس اے عزیزانِ ملت اداے بقیہ ماتم زدگان قافلۂ اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا دھم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں۔ اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیرو ئے توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان ملت کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو۔ اگر مراکش میں ایک حامی وطن کے حلق بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرے ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی پر لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعت نزع میں

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی آواز نکل رہی تھی تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو اگر اپنی گردنوں میں اس کے نشان محسوس نہ کریں۔ اگر آج طرابلس کے میدان میں حامیٔ کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھلنی ہو رہے ہیں تو ہم اللہ، اس کے ملائکہ اور اس کے رسول کے آگے ملعون ہوں۔ اگر اپنے پہلوؤں کے لئے ایک لمحہ کیلئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ حالانکہ اگر اسلام کی روح کا ایک ذرہ بھی اس کے پیروؤں میں باقی ہے تو مجھ کو کہنا چاہیئے کہ اگر میدان جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کہ کوئی ہندوستان کا مسلمان، مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ دل میں محسوس نہ کرے۔ کیونکہ ملت اسلام ایک جسم واحد ہے، اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضاء و جوارح۔ اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضاء کٹ کر الگ نہ ہو گئے ہوں ممکن نہیں کہ اس کے صدمہ سے بے خبر رہیں۔　(ابو الکلام صاحب آزاد۔ الہلال $\frac{11}{1912}$ ۱۶)

اب تو آپ کو اس کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ بادشاہوں کے درباروں میں جو علمائے کرام زینت دہ مسانیدِ ارشاد و موعظت ہوا کرتے تھے وہ اپنے آقایانِ نعمت کی خاطر کیا کیا فتوے صادر نہیں فرما دیتے ہوں گے۔ اُس وقت کے اسی قسم کے علماء آج ہمارے اسلاف کی حیثیت سے قابلِ پرستش بن چکے ہیں اور آج کے حسین احمد اور ابو الکلام آنے والی نسلوں کیلئے قطب اور ابدال ہوں گے۔

اسلامی حکومتیں

اسلامی دنیا کے یوم۔ تقریب (کراچی) میں تقریر کرتے ہوئے محترم ملک فیروز خاں صاحب نون نے فرمایا۔

مسلمانوں کو پردہ اٹھا دینا چاہیئے کیونکہ یہ ان کی ترقی کی راہ میں حائل ہے۔ انہیں خود قرآن پڑھنا چاہیئے اور محض ان باتوں کی پیروی نہیں کرنی چاہیئے جو مُلّا کہتا ہے اس لئے کہ مُلّا روح اسلامی سے ناآشنا ہے۔ مسلمانانِ پاکستان کو ترکی اور ایران کی طرف

دیکھنا چاہیئے۔ اور ان ہی سے اسلام کا مفہوم سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہی ممالک اسلامی اور ترقی یافتہ ہیں۔ (ڈان یکشنبہ ۱۰/۵)

ہم اس وقت پردہ کی بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتے کہ یہ بحث اہم اور معاملہ نازک ہے اور ضمناً اس پر گفتگو نہیں ہو سکتی۔ طلوع اسلام کے پاس اس باب میں متعدد تقاضے پہنچ چکے ہیں۔ جونہی اہم موضوعات سے فرصت ملی انشاء اللہ اس معاشرتی مسئلہ پر بھی قرآن کی روشنی میں تفصیلی گفتگو ہو جائے گی۔ اس وقت صرف ہمیں یہ بتانا ہے کہ ان حضرات کے سامنے اسلامی حکومتوں کی بہترین مثال ترکی اور ایران ہے۔ ترکی کانوں پر ہاتھ رکھ رہا ہے کہ ہماری حکومت اسلامی نہیں۔ غیر دینی (Secular) ہے اور ایران پر اس ملوکیت کی لعنت مسلط ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ہیں ہمارے اکابر جن سے مسلمان توقع وابستہ کئے بیٹھے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ کریں گے۔ جو مسلمانوں کو اسلام فہمی کے لئے ترکی اور ایران کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کریں ان کی اسلام فہمی کو ہزار اسلام۔

اس سہاگ سے تو رنڈاپا اچھا۔

لیکن ملک صاحب کو تو پردہ اٹھانے کی سند درکار تھی۔ وہ جس جگہ سے مل جائے اسلامی ہے۔

٭

پاکستانی سکے

یوں تو پاکستان ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ہی زندہ حقیقت بن گیا تھا لیکن ہند کی انتظامی تقسیم بتدریج جاری رہی تا آنکہ اپنے علیحدہ سکوں کے بن جانے کے بعد پاکستان کی علیحدگی مکمل ہو گئی۔ للہ الحمد آج ہم اس قابل ہوئے کہ اپنا سکہ رائج کریں۔ خدا کرے کہ پاکستان کا صحیح مقصد پورا ہو اور ہم اپنا۔ اسلام کا۔ سکہ بھی رائج کر سکیں۔

پاکستانی سکوں میں شاہی تصویر کے بجائے چاند اور ستارہ ثبت ہے۔ یہ ناگزیر تھا۔ لیکن عمومی حیثیت سے ڈیزائن میں ہندوستانی سکوں کی کورانہ تقلید کی گئی ہے۔ ڈیزائن کے علاوہ سکوں پر قیمت لکھنے میں بھی اسی کورانہ تقلید کو روا رکھا گیا ہے۔ ڈیزائن کی تقلید تو ایک حد تک (۔۔۔ صرف ایک حد تک) قابل معافی تھی لیکن الفاظ کی تقلید مذموم و مردود ہے۔ ہندوستان میں آٹھ آنے کے سکے پر ہشت آنہ اور

چار آنے پر، چہار آنہ لکھا ہوا کرتا تھا۔ نہرو کی عارضی حکومت کے زیر اہتمام جو نئے سکے مضروب ہوئے ان پر ہشت آنہ اور چار آنہ کی بجائے آدھ روپیہ اور پاؤ روپیہ ثبت کر دیا گیا۔ یہ اصطلاحیں ہر چند روزمرہ کے استعمال اور عام بول چال کی نہیں تھیں لیکن اس مریض ذہنیت کی آئینہ دار تھیں جس نے اردو کو ہندوستانی بنا دیا تھا۔ ہندوستان میں تو خیر یہ قابل فہم تھا کہ ہندو مسلمان کی ضد میں اردو کا ستیاناس کر کے ہندی کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ لیکن پاکستان میں اس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں۔ حیرت کا مقام ہے کہ پاکستانی سکوں پر بھی آدھ روپیہ اور پاؤ روپیہ لکھا گیا ہے۔ حالانکہ یہ اصطلاحیں پاکستان میں کہیں مروج نہیں۔ اردو میں کہ پاکستان کی مسلمہ سرکاری زبان ہے۔ ایسا نہیں بولا جاتا۔ صوبائی زبانوں میں بھی ایسے الفاظ مستعمل نہیں۔ اگر بالفرض ہوں بھی تو انہیں مرکزی سند حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہشت آنہ اور چار آنہ کی فارسی تراکیب پاکستان میں بالکل مانوس تھیں۔ انہیں از سر نو رائج کیا جا سکتا تھا۔ یا اگر یہ مناسب نہ تھا تو ان کی بجائے آٹھ آنہ (اٹھنی) اور چار آنہ (چونی) کو منتخب کرنا چاہیے تھا کہ یہی الفاظ زبان زد عوام ہیں۔

ہم اس تبصرہ کی زحمت گوارا نہ کرتے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ حکومت پاکستان کے کارندے ۔۔ الا ماشاء اللہ؟ ۔ ندرت فکر و عمل سے معرا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا انداز کار دفتری ہے اور دفتر کا مثالی نمونہ ان کے نزدیک ہندوستان ہے۔ پاکستان کے دفتری نظام کو یہ دیمک چاٹ رہی ہے یہ اکاس بیل دن بدن پھیل رہی ہے اور نظام پژمردہ ہو رہا ہے۔ پاکستان کو ان پامال راہوں اور فرسودہ روایات کو لامحالہ ترک کرنا پڑے گا۔

زبان کے معاملہ میں حکومت کو خصوصیت سے محتاط ہونا چاہیئے کیونکہ حکومت کی زبان کا عوام پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اگر حکومت کی زبان مستعمل زبان سے مختلف اور غیر مانوس ہو گئی تو ملک میں ایک لسانی الجھن پیدا ہو جائے گی۔ اور یہ الجھن وہی ہو گی جس کا حل ہندوستان میں ابھی تک نہیں ہو سکا۔

پاکستانی وزراء کے مشاغل

معاصر ڈان کا نامہ نگار خصوصی اس دلچسپ خبر کا ذمہ دار ہے کہ پاکستان کے وزیر مالیات مسٹر غلام محمد ایک شام کلفٹن کے ساحل پر مصروف پتنگ بازی تھے۔ تھوڑی دیر میں ایک اور وزیر پاکستان مسٹر غضنفر علی بھی آ گئے اور وہ بھی پتنگ بازی میں بھائی وزیر کے شریک بن گئے۔

لب ساحل مشاغل رنگین بھی ہوتے ہیں اور دلچسپ بھی۔ یہاں کے نظارے جلالی بھی ہوتے ہیں اور جمالی بھی۔ انگلستان اور دیگر مغربی ممالک میں ساحل ان مقامات میں شمار ہوتا ہے جہاں عقل کا پاسبان دل کے پاس نہیں رہتا۔ اُدھر پانی کا جلال ہوتا ہے، اِدھر انسان کا جمال۔ بگلوں اور دیگر ساحلی اور آبی جانوروں کی دلچسپی زیادہ تر افادیاتی پہلو لئے ہوتی ہے۔

اقبال کو ساحل کی بزم آرائی سے اصولی اختلاف تھا کہ۔۔۔ آنجا

نوائے زندگانی نرم خیز است

اقبال نے محض اظہار اختلاف پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ مشورہ دیا کہ

بدریا غلط و با موجش در آویز

حیات جاوداں اندر ستیز است

ہمارے وزراء اقبال سے اس حد تک تو ضرور اتفاق کر سکے کہ ساحل تک محدود نہیں رہنا چاہیئے۔ وہ آگے بڑھے لیکن پا در آب نہیں بلکہ پا در ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ زمین کے ہنگاموں سے فارغ ہو چکے ہوں اور سعدی کے الفاظ میں آسمان پردازی شروع کر دی ہو۔ یا ہوا کو آب پر ترجیح دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وزارت ۔۔۔ بلکہ خود پاکستان ۔۔۔ بادآورد ہے ۔۔۔ یعنی آندھی کے بیر۔ لیکن یہ مشق بہرحال اچھی تھی کہ پاکستان میں ہنوز ہوائی قلعے تعمیر ہو رہے ہیں۔

ازلی اچھوت

اچھوت عمر بھر اچھوت رہتے ہیں۔ موت کے بعد ہو سکتا ہے کہ کسی اور جون میں ظاہر ہوں۔ موت سے پہلے ان کی ذات کی تبدیلی کا سوال خارج از بحث ہے

مسلمانوں نے بھی ہندوؤں سے متاثر ہو کر اپنی معاشرۃ میں وہی ذات پات پیدا کر لی ہے جو نظری طور پر ہی نہیں عملاً ساری دنیا میں۔ سوائے ہندوؤں کے متروک و مذموم ہے۔ پاکستان میں سرکاری ملازمین میں اچھوتوں کی ایک جماعت ہے جسے ماتحت عملہ کہتے ہیں۔ اس کی حیثیت صرف اس قدر ہے کہ وہ برہمن افسروں کی خدمت کرے اور اسی میں اپنی نجات سمجھے۔

ایک مرتبہ ہم نے ایک انتہائی قابل نفرت بورڈ کا ذکر کیا تھا جس سے مرکزی حکومت کے کچھ دفتروں کا ایک دروازہ، صرف افسران کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہ بورڈ تو اب اتر گیا ہے لیکن:۔

مرد جعفر زندہ روح او ہنوز

کے مصداق یہ علامت تو نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے لیکن مرض بدستور موجود ہے۔ اس کی ایک اور مثال پاکستان نیشنل گارڈز ہے جس کا قیام اس لئے عمل میں لایا گیا تھا کہ غیر فوجی افراد ملت کو فوجی تربیت دی جائے اور انہیں تیار کیا جائے تاکہ وہ بھی بوقت ضرورت ملک و ملت کا تحفظ کر سکیں۔ اس جماعت میں سرکاری افسر بھی شامل ہیں اور ماتحت بھی۔ بجائے اس کے کہ اس عسکری جماعت میں اس اخوت و مساوات کا عملی مظاہرہ کیا جاتا جس کا شور حکومتی حلقوں سے اکثر بلند ہوتا رہتا ہے، یہاں قاعدہ یہ بنایا گیا ہے کہ سول محکموں کے افسر یہاں بھی افسر ہوں گے۔ چنانچہ کئی ماتحت عملہ کے ایسے افراد جو پہلے سے تربیت یافتہ ہیں اور جنہوں نے یو۔ ٹی۔ سی یا ایسے اداروں سے فوجی قسم کی تربیت حاصل کر رکھی ہے اور جو اپنے ہمراہیوں کو سکھانے میں معین و ممد ہو سکتے ہیں انہیں غیر تربیت یافتہ افسروں کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ اس طرح نہ محض ان کی تربیت سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا بلکہ خواہ مخواہ کی تضحیک اوقات بھی کی گئی۔ اور یہ تفریق بھی روا رکھی گئی کہ سول کا افسر یہاں بھی افسر ہے خواہ وہ شطرنج کے پیادے جتنا بھی نہ ہو۔ اس جماعت میں یہ ایسی اصولی خرابی ہے جو اسے کامیاب نہیں ہونے دے گی یا اسے اس راہ پر ڈال دے گی جو ہماری منزل کی طرف نہیں جاتی۔

ہمیں امید ہے کہ حکومت ادھر توجہ کرے گی اور اپنے قول اور فعل میں مطابقت پیدا کرنے کے خیال سے ہی اس قابل مذمت تفریق کو ختم کر دے گی۔

ملی ترانہ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشنز صوبہ سرحد نے ایک انعامی مقابلہ کا بدیں مقصد اعلان کیا ہے کہ پشتو میں ایسا قومی گیت لکھا جائے جو سکولوں کے بچے پرچم کشائی یا دیگر موقعوں پر گایا کریں۔ گیت کا مرکزی خیال پاکستان سے وفاداری ہوگا۔ صحیح مرکزیت کے نہ ہونے سے پاکستان میں صوبائی انتشار ہے اور ہر صوبہ بفحوائے کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ اپنی اپنی جداگانہ راہ پر بے مہار جا رہا ہے۔ قومی ترانہ کا مسئلہ صوبائی نہیں بلکہ مرکزی ہے اور حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کا قومی ترانہ کیا ہو؟ جہاں تک ہمیں علم ہے حکومت پاکستان نے اس ضمن میں ابھی تک کوئی عملی اقدام نہیں کیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج صوبہ سرحد کو پشتو میں علیحدہ قومی گیت کی ضرورت محسوس ہوئی، پاکستان سے وفاداری، کی شرط کا اعلان کر کے صوبہ سرحد نے اس نفسیاتی الجھن کا اعتراف کیا ہے جو موجودہ بے مرکزی کے دور میں ناگزیر ہے۔ یہ شرط در اصل صوبائی ترانہ کے لئے معذرت ہے۔ سرحد اپنے لئے قومی گیت تجویز کرلے گا تو اس کی دیکھا دیکھی پنجاب، سندھ، بلوچستان اور بنگال بھی اپنے اپنے جداگانہ قومی گیت وضع کرلیں گے۔ دیگر صوبوں کے پاس بھی وہی معقول وجوہات ہوں گی جو صوبہ سرحد کے پاس ہیں۔

صوبہ سرحد پاکستان سے نام نہاد وفاداری کے لباس میں پٹھانستان کے اس پودے کو از سر نو پانی دے رہا ہے جسے خان برادران نے بویا تھا اور جس کی آبیاری کانگرس نے کی اور استیصال مسلم لیگ نے۔ تعجب ہے کہ جو شے خان برادران کے ہاتھوں میں اکاس بیل نظر آتی تھی، وہ مسلم لیگی حکومت کے ہاتھوں میں آکر خوشنما پھول بن جاتی ہے۔ آج پشتو میں ایک قومی گیت وضع ہوگا کل پشتو بولنے والے ایک علیحدہ قوم بن جائیں گے۔ اس طرح غیور پٹھانوں نے

جس لاش کو استصواب کے ہاتھوں دفن کیا تھا اس کی کایا کلپ کر کے اسی کا تحفہ خان بھائیوں کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ ابھی اگلے دن وزیر اعظم پاکستان نے کہا تھا۔

میرے نزدیک صوبائی عصبیت ہی تنہا وہ خطرہ ہے جو نہ صرف مملکت پاکستان کو کمزور ہی کر دے گا بلکہ اس کی ہستی کو فنا کر دے گا۔ جو لوگ صوبائی عصبیت کی تبلیغ کرتے ہیں وہ مملکت پاکستان کے ہلاک ترین دشمن ہیں۔

صوبائی عصبیت کی تبلیغ کرنے والے تو پاکستان کے ہلاک ترین دشمن ہیں۔ لیکن اس کی عملی ترویج کرنے والے؟ وہ پاکستان کے دشمن نہیں بلکہ اس کی حکومت ہیں! خان برادران بھی تو پٹھانستان کے دعویدار ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان سے وفاداری کا عہد کرتے ہیں۔ ان کے دعوؤں کو متضاد مانتے ہوئے حکومت سرحد کے اس فعل کو کیسے سراہا جا سکتا ہے؟ جانبین ایک ہی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو پھر ردعمل میں تفاوت کیوں؟

ہم اس صوبائی انتشار کے لئے خود مرکزی حکومت کو ذمہ دار سمجھتے ہیں۔ قومی ترانے کے معاملہ میں کئی اور معاملات کی طرح حکومت پاکستان نے مناسب ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا۔ اس جانب عاجلانہ توجہ کی ضرورت تھی لیکن حسب عادت ادھر بھی بے اعتنائی کو ہی روا رکھا گیا ہے۔ طلوع اسلام کی مارچ کی اشاعت میں ہمارے دو نامہ نگاروں نے قابل توجہ مشورے دیئے تھے ان کو اس سلسلہ میں پیش نظر رکھا جا سکتا ہے۔ حال کی خبر یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے قومی ترانہ مدون کرنے والے کے لئے دس ہزار روپیہ کی پیش کش کا اعلان ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ ہنوز اپنے ابتدائی مراحل بھی طے نہیں کر پایا۔ اندریں حالات حکومت کو کم از کم اتنا تو چاہیئے کہ مرکزی فیصلہ ہونے تک صوبائی کوششوں کو روک دے۔ حکومت پاکستان میں صوبوں کا جداگانہ ترانہ چہ معنی دارد؟ پاکستان اپنے لئے جو ترانہ منتخب کرے گا وہی صوبوں کا ترانہ ہوگا۔ صوبہ سرحد کے اس اقدام کو روکا نہ گیا تو ہر صوبہ اپنا اپنا علیحدہ بت کھڑا کرے گا اور اس کا نتیجہ صوبائی قومیت ہوگا، جس سے اسلام کی جڑ کٹے گی۔

۳- قوم کے غم میں !

"ان خواتین کے رنگین ملبوسات کی بھڑک اور ان کی روپہلی آوازوں کی کھنک نے، لارنس باغ کی فضا کی رنگینیوں میں اور بھی اضافہ کر رکھا تھا" (ڈان ۲/۴۸ ۶)

معلوم ہے کہ یہ کس اجتماعِ رنگ و نعطر کی روئداد ہے اور وہ کون سی خواتین ہیں جن کے روپہلی نغمات اور سنہری ملبوسات کا تذکرہ جمیلہ جہانِ تصور کو اس طرح دامانِ باغباں و کفِ گل فروش بنا رہا ہے؟ یہ روئداد ہے اُس مینا بازار کی جسے "مستوراتِ لاہور کی پناہ گزینوں کی کمیٹی" نے پناہ گزینوں کی امداد کے سلسلہ میں ترتیب دیا تھا اور جس میں ہمارے ممتاز راہنمایانِ ملت کی بیگمات نے حصہ لیا تھا، یہ اُن پناہ گزینوں کی امداد ہو رہی ہے۔ جن میں ہماری لاکھوں مائیں اور بہنیں ایسی ہیں جنھیں ستر ڈھانپنے کے لئے چیتھڑا تک میسر نہیں۔ جن کے شیر خوار بچے ایک گھونٹ دودھ کی خاطر بلک بلک کر جان دے رہے ہیں۔ جن کے معصوم کم سن ایک کمبل کے نہ ہونے سے سردی سے اکڑ کر مر رہے ہیں جنھیں آسمان کی نیلی رواق کے سوا کوئی چھت نصیب نہیں۔ یہ ان کی امداد کے لئے لارنس باغ کی مست فضاؤں میں مسرتوں کے جھولے جھلائے اور خوشیوں کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ مظلوموں اور بے کسوں کی بپتا مٹانے کے کیسے حسین انداز ہیں! دن بھر طرب و نشاط کی محفلیں گرم کیں۔ شام کو دو دو چار چار پیسے اکٹھے کر کے ریلیف فنڈ میں بھیج دیئے۔ اخبارات میں ان بیش بہا قربانیوں کا چرچا ہوا۔ ریڈیو نے اس ایثار کے ڈھول پیٹے۔ بیگم صاحبہ کی ملی خدمت پر میاں صاحب نے مونچھوں پر تاؤ دیا اور انھیں آئندہ الیکشن کیلئے لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ نہ ہوئے آج لسان العصر (حضرت اکبر الہ آبادی) ورنہ معلوم ان کی صدائے دردناک کیا کچھ کہتی!

یہ ریلیف فنڈ بھی ہمارے لئے عجیب تماشے کا موجب بن رہے ہیں۔ کسی ڈرامیٹک کمپنی کا "نئے سین سینریوں" سے کھیل ہو یا کسی سنیما کا فریب نگاہ افتتاح، کسی مغنی آتش نفس کی محفل رقص و سرود ہو یا کسی بھانڈ کا تماشا۔ ایک عشر کا اعلان ریلیف فنڈ کے لئے کر دیجئے، پھر دیکھئے ان میں شرکت کس طرح نہ صرف ملی خدمت ہی میں شمار ہوتی ہے بلکہ کارِ خیر ہونے کی وجہ سے ثواب کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ دنیا اور آخرت کی "برکات" اس طرح حاصل ہوتی ہیں! کس قدر بدبخت ہیں وہ جو

اب بھی محروم رہ جائیں!!

آؤ۔ آگے بڑھو۔ قوم پر ایسی افتاد روز روز نہیں پڑا کرتی!

پس از مدت گذار افتاد ایں جا کاروانے را!!

تہذیب کا مآل

"امریکہ نے ایک ایسا جوہری بادل ایجاد کیا ہے کہ جو اس سے متمسک ہوا ختم ہوگیا۔ یہ بادل، ایٹم بم سے بھی زیادہ اثر انگیز ہے اور اس کی ہلاکت آفرینی کی تاثیر بہت دیرپا ہے۔ بس اتنا ہی نقص ہے کہ اگر کہیں ہوا کا رُخ بدل جائے تو یہ پھر اپنوں کو بھی اسی طرح ہلاک کر دیگا۔

نیز امریکہ نے اب ان ایٹم بموں سے بھی بڑے بڑے بم ایجاد کر لئے ہیں جو اس نے جاپان کے خلاف استعمال کئے تھے۔

علاوہ بریں ایسے ایسے قاطع حیات جراثیم پیدا کر لئے گئے ہیں جو اس قسم کی بیماریاں پیدا کر دیں گے جن سے انسان کبھی جانبر نہ ہو سکے۔ یہ اس قسم کی ایجادات ہیں کہ اگر آئندہ جنگ ہوئی تو اس کا فیصلہ ساٹھ دن کے اندر اندر ہو جائے گا۔ (ہندوستان ٹائمز ۔ ۴۸ء)

یہ ہے اس ترقی کی معراج جس کے نزدیک زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے اور بس!

انساں کہ رُخ زغازۂ تہذیب برفروخت — خاکِ سیاہ خویش چو آئینہ وا نمود

دیدم چو جنگ پردۂ ناموس ما درید — جز بیسفک الدماء و خصم مبیں نبود

دوسرا اسپین

جرمنی میں اس وقت ستر لاکھ عورتیں ایسی ہیں جنہیں کبھی شوہر نصیب نہیں ہو سکتا۔ (اس حساب سے) وہاں ہر تیسری بالغ عورت ایسی ہے جسے یا تو عمر بھر بلا شوہر رہنا ہوگا۔ یا پھر یک زوجگی کی مروجہ رسم کے خلاف، کسی بیوی والے کو شوہر بنانا ہوگا:

(ڈان۔ یکم ۹)

یہی قسم کی تھیں وہ تمدنی ضروریات جن کے لئے اسلام نے تعدد ازواج کا حل تجویز کیا تھا لیکن

جس کی تمام "مہذب دنیا" اس طرح ہنسی اڑاتی تھی۔ اب حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر یہ "مہذب دنیا" اسی "دقیانوسی" علاج کی طرف رجوع کر رہی ہے۔ لیکن مہذب دنیا کی یہ ہنسی درحقیقت، قرآن کے اس علاج کے خلاف نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کے اس طرز عمل کے خلاف تھی جس میں انہوں نے اس دوائی کو بطور غذا استعمال کرنا شروع کر دیا اور جس میں

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

قرآن میں تعدد ازدواج کا ایک جگہ (صرف ایک جگہ) ذکر ہے اور وہ اس انداز سے ہے کہ اگر قوم میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ مرد (مثلاً جنگ میں) ضائع ہو جائیں تو لاوارث خاندانوں کی پرورش کا انسب طریق یہ ہے کہ اس بیوہ (یا خاندان کی کسی اور مناسب خاتون) سے شادی کر لی جائے (خواہ پہلی بیوی موجود ہو اور تم دیکھو کہ اس طرح اس کی حق تلفی نہیں ہو گی) اور اس طرح دو دو، تین تین، چار چار خاندانوں کو اپنی کفالت میں لے لیا جائے تاکہ ان کی پرورش کا انتظام اس انداز سے ہو جائے کہ ان کی غیرت کو بھی ٹھیس نہ لگے اور قوم بہت سی اجتماعی خرابیوں سے بچ جائے۔ یہ اجازت سورۂ نساء کی تیسری آیت میں ہے اور یتیموں سے متعلق احکام کے ضمن میں آئی ہے (اس وقت ان ہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ تفصیلی طور پر کبھی پھر لکھا جائے گا) یہ تھی تعداد ازدواج کی اجازت کی شکل اب اس کے بعد دیکھئے کہ مسلمانوں نے اس اجازت کی کس طرح سٹی پلیٹ کی ہے اور کس طرح اس تمدنی علاج کو اپنی ہوس کامرانی کا مضحکہ انگیز اور رسوا کن ذریعہ بنایا ہے جس سے اسلام جیسا دین فطرت ساری دنیا کی نگاہوں میں اضحوکہ بن کے رہ گیا۔

ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو!

جادو وہ جو... قائد اعظم شیر کشمیر حضرت شیخ محمد عبداللہ (علیہ ما علیہ) نے مشرقی پنجاب میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا۔

مذہب کا رشتہ انسانوں کو متحد کرنے کا ذریعہ بہت کم ہوا ہے۔ وہ رشتہ جو سب سے

مضبوط اور ناقابل شکست ہے، معاشی رشتہ ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا۔ ۱۲-۳-۴۸)

واہ۔ واہ! سچی بات کس طرح بے ساختہ نکل گئی ہے اس عبداﷲ دینار کے منہ سے!! اس میں کیا کلام ہے کہ پیسے کا رشتہ ہی حقیقی رشتہ ہے۔ ورنہ دنیا جانتی ہے کہ شیخ محمد عبداﷲ اور مسٹر ی بیت پٹیل میں کیا وجہ یگانگت ہو سکتی ہے؟

شاعروں کی قوم حکومت ہند کے وزیر دفاع، سردار بلدیو سنگھ نے مقننہ کے اجلاس میں یہ انکشاف فرمایا کہ ان کی "نیشنل کیڈٹ کور" (قومی جماعت عسکریت) میں، درجۂ اعلیٰ یونیورسٹی اور کالجوں کے لئے ہے جو 32,500 رضا کاران پر مشتمل ہے اور درجۂ ثانوی، اسکول کے لڑکوں کا ہے جس میں ایک لاکھ پینتیس ہزار رضا کاران ہیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے کہا کہ

"یہ تو ہنوز ابتدا ہے۔" (اسٹیٹسمین ۱۴-۳-۴۸)

اس پر ہم نے اپنے ایک دوست سے پوچھا کہ ہمارے کالجوں کے نوجوان، قومی فوج میں کیوں دلچسپی نہیں لے رہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ شاعروں کی قوم ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ فوج اور لشکر سب بیکار چیزیں ہیں۔

مرنے والا تو نقطوں پہ مر جاتا ہے

اس لئے یہ سب دردِ سری کا ہے کے لئے!

سندھ میں قانون شریعت سندھ میں پیر الٰہی بخش صاحب کی وزارت عظمیٰ کے قیام کے ساتھ ہی۔ شرعی قوانین کے نفاذ کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ حکومت سندھ کا ایک منشور، مطبوعہ ڈان مورخہ ۱۶-۳-۴۸ء مظہر ہے کہ

حکومت سندھ نے حکم دیا ہے کہ تاڑی۔ دیسی اور انگریزی شراب کی تمام دکانیں جو

---

۱ ان صاحب نے یہ القابات خود اپنے لئے تجویز فرمائے ہیں۔

کے دن اور چند ایک تعطیلات کو بند رہا کریں گی۔ البتہ ہوٹل، کلب اور کینٹین اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

فرمائیے! اب بھی آپ کو گلہ ہے کہ پاکستان اسلامی حکومت نہیں اور اس میں قوانین شریعت کا نفاذ نہیں ہوتا؟ اب تو حضرت پیر الٰہی بخش صاحب ایدہ اللہ بنصرہ یقیناً اس کے مستحق ہو چکے ہیں کہ ان کا اسمِ گرامی جمعہ کے خطبوں میں داخل کر دیا جائے۔

اب اس کے بعد اگلا منشور اس حکم پر مشتمل ہو گا کہ جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب تمام قحبہ خانے بند کر دیئے جائیں۔ ہوٹل اور کلب اس حکم سے بھی حسب معمول مستثنیٰ رہیں گے۔

اور کیا عجب ہے کہ شعبان کے آخری دنوں یہ منشور بھی شائع ہو جائے کہ رمضان المبارک کے احترام میں ایک مہینہ کیلئے رشوت بھی بند کی جاتی ہے البتہ عدالتیں اس حکم سے مستثنیٰ رہیں گی۔

لیڈرانیاں

سابقہ اشاعت میں ہم نے لکھا تھا کہ دنیا میں ہر کام کے لئے قابلیت اور استعداد کی ضرورت ہوتی ہے بجز مسندِ حکومت کے۔ اس پر قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب رقمطراز ہیں:۔

•آپ کو صرف اسی پر حیرت ہے کہ کرسی حکومت پر فائز ہونے کیلئے کسی قابلیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت کا مقام اس سے ذرا آگے بڑھ کر آتا ہے۔ یعنی یہی نہیں کہ کرسی حکومت پر بیٹھنے والا ہی اپنے آپ کو ملت کا بہترین دماغ سمجھنے لگ جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان کی بیگم صاحبہ بھی فوراً لیڈرانی بن جاتی ہیں۔ میاں لڑکوں کے کالج کا افتتاح کرنے جا رہے ہیں تو بیوی صاحبہ نرسنگ ہوم کے تقسیم انعام کے جلسہ کی صدارت فرما رہی ہیں۔ وہ یوم استقلال کے جشن مسرت میں سنت شبیری کی تلقین فرما رہے ہیں اور یہ پردہ باغ کی نمائش میں اسوۂ فاطمیؓ کی تقلید کی تاکید کر رہی ہیں۔ حالانکہ نہ انہیں معلوم ہے کہ سنت شبیری کے غایات کیا ہیں اور نہ انہیں پتہ کہ اسوۂ فاطمیؓ کے مخصوصیات کیا؟ لیکن باایں ہمہ وہ مردوں کے واحد قائد ہیں اور یہ عورتوں

کی امام۔ اور کوئی پوچھنے والا نہیں کہ بالآخر یہ قیادت و امامت کن خصوصیات کی بنا پر آپ کے حصہ میں آئی ہے۔ خدا حافظ ہے اس قوم کا جس کی قیادت اس طرح سے بٹ رہی ہو۔ جو لوگ اپنی ذاتی جائدادوں تک کا انتظام نہیں کر سکتے۔ انہیں امور سلطنت کا نظم و نسق سونپ دیا جاتا ہے۔ اور جو بیگمات اپنے گھر بھی درست نہیں رکھ سکتیں، وہ تعمیر امومت کا فریضہ سنبھال لیتی ہیں۔ اگر ان ہی کی زندگیاں قوم کے لئے باعث تقلید ہیں تو

خدا ایں سخت جاں را یار بادا!

عیش!

چودھری خلیق الزمان صاحب نے کوئٹہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔ پاکستان میں قوانین شریعت، بالخصوص شرعی حدود (سزاؤں) کے نفاذ کا وقت ابھی نہیں آیا۔ یہ تعزیری قوانین اس وقت تک نافذ نہیں کئے جا سکتے جب تک مسلمان اپنی اصلاح کر کے سچے معنوں میں مسلمان نہ بن جائیں۔ جس ملک میں کامل متقی اور پرہیزگار لوگ نہ بستے ہوں وہاں ایسے قوانین کا نافذ کر دینا جن کی رو سے چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ یا زانی کو سنگسار[1] کر دیا جائے۔ بڑا خطرناک ہے

(ڈان ۲۰ مئی)

بالکل درست! جب تک ملک میں جرائم پیشہ اور بدمعاش لوگ موجود ہیں اس وقت تک تعزیری قوانین کا نافذ کرنا بڑا خطرناک ہے۔ قانون تو ہوتا ہی شریفوں کے لئے ہے۔ بدمعاشوں اور غنڈوں کے لئے قانون کی کیا ضرورت۔ مسلمان پہلے اپنی اصلاح کر کے سچے معنوں میں مسلمان بن جائیں۔ ہر طرف متقی اور دیندار لوگ دکھائی دیں۔ پھر ان کے ہاتھ بھی کاٹئے اور سنگسار بھی کیجئے۔ کیا مجال جو کوئی سامنے سے اُف بھی کر جائے۔ بدمعاشوں کو سزائیں دینا واقعی خطرناک ہے۔ اگر یہ خطرناک نہ ہوتا

---

[1] کیا ہم چودھری صاحب سے پوچھ سکتے ہیں کہ سنگساری کی سزا قرآن کی کونسی آیت میں آئی ہے؟

تو پاکستان میں اتنے سفید چور کس طرح دندناتے پھرتے! حضرت پیران پیر کی ایک کرامت مشہور ہے کہ آپ نے ایک اشارہ میں چور کو قطب بنا دیا تھا۔ یہاں روز چوروں کو قطب بنا دیا جاتا ہے۔ ان قطبوں کا ہاتھ کون کاٹ سکتا ہے! ابھی واقعی شرعی سزاؤں کا زمانہ نہیں آیا۔ اگر شرعی حد جاری کر دی جائے تو نہ معلوم کیسے کیسے معتبر ہاتھ خزاں کے پتوں کی طرح جھڑتے چلے جائیں۔ ابھی ہر طرح سے عافیت ہے۔ عیش کرو آزادی کی بڑی برکتیں ہیں۔

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ نو در اندازیم

حکومت توجہ کرے

ہم نے مارچ کی اشاعت میں حکومت کی توجہ اس طرف منعطف کرائی تھی کہ پاکستان کے مرکزی دفاتر کے ملازمین کو نماز، بالخصوص نماز جمعہ، کی سخت تکلیف ہے اس لئے حکومت ان کے لئے بہت جلد مسجد کا انتظام کرے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ حکومت نے اس ضمن میں ابھی تک کچھ نہیں کیا یہ سکوت کچھ اچھے قرائن کا آئینہ دار نہیں۔ کیا حکومت اب بھی توجہ کرے گی؟

مسجد کا انتظام کیا جائے اور ساتھ ہی جمعہ کے نصف آخر کی تعطیل منسوخ کر کے تمام افسران اور عملہ کو اجتماع جمعہ میں شریک کیا جائے۔ ان کی یک جہتی کی کوئی صورت تو پیدا ہو!

طاؤس و رباب اوّل، طاؤس و رباب آخر

عمل کے صالح یا غیر صالح ہونے کا معیار وہ نتائج ہیں جو اس سے مترتب ہوتے ہیں۔ ہر وہ عمل جو کسی مقصد کو سامنے رکھ کر نہ کیا جائے یا جو پیش نظر مقصد کے حصول کو ممکن اور سہل نہ بنائے عمل غیر صالح ہے اور عبث۔ انسان نے اپنی طویل مدتِ حیات میں جہاں خصوصی اغراض اور وقتی مصالح کے تحت کوئی غلط راہ اختیار کی تو اس پر چل نکلنے کے بعد وہ ایسا بھٹکا کہ اس سے رجعت نہ ہو سکی۔ چنانچہ باوجود چلتے جانے اور چلتے رہنے کے منزل صحیح دور سے دور تر ہوتی گئی۔ ایسے راہ گم کردگان نے غلطی کا کشادہ دلانہ اعتراف کرنے کے بجائے یہ خود فریبانہ نعرہ ایجاد کیا کہ "کوشش بیہودہ بہ از خفتگی" کشمکش حیات میں خفتگی کے نتائج ظاہر ہیں لیکن اس پر کوشش بیہودہ کو بھی تو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ قرآن نے کفار کے اعمال کے متعلق کہا ہے:

حبطت اعمالھم فی الدنیا والاخرہ

ان کے اعمال دنیوی اور اخروی زندگی میں ان کے کسی کام نہ آئے اور ان کی فوز و فلاح کے ضامن نہ بن سکے۔ کفار "بے عمل" نہیں ہوتے۔ وہ کولھو کے بیل کی طرح چلتے رہتے ہیں۔ البتہ ان کے چلتے رہنے سے منزل طے نہیں ہوتی۔ وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ان کے اعمال نتیجہ خیز نہیں ہوتے۔

ہم نے اشاعت مارچ میں حکومت اور ملت کے مابین خلا کے اسباب و علل کا جائزہ لیتے ہوئے مشورہ دیا تھا کہ اگر حکومت کا محکمہ اطلاعات فرسودہ، دقیانوسی اور بے منزل راہوں پر چلنے کی بجائے صحیح خطوط پر کام کرے تو خاطر خواہ نتائج پیدا ہو سکیں گے۔ ادھر یہ مخلصانہ مشورہ ہمارے قلم سے صفحۂ قرطاس پر آ رہا تھا اور اُدھر ایوانِ حکومت میں "رابطہ عوام" کی عجیب و غریب کھچڑی پک رہی تھی۔ ہمیں یہ دیکھ کر از حد قلق ہوتا ہے کہ اربابِ حکومت پاکستان عمومی اعتبار سے مقلد محض ہیں۔ وہ انہی

پامال راہوں پر چل رہے ہیں جن پر ان کو ہندوستان میں چلایا جاتا رہا ہے۔ ان کا عاجز تخیل خوب تر نظاروں تک پہنچ نہیں سکتا۔ ان کا فکر شکستہ پر، قفس میں پھڑپھڑا سکتا ہے لیکن آزاد فضا کی پہنائیوں کا تصور نہیں کر سکتا۔

ہندوستان میں جنگ کے دوران میں ادارہ یونائیٹڈ پبلیکیشنز کے زیر اہتمام مختلف رسالے مختلف زبانوں، عربی، فارسی، اردو، پشتو وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ وہ ادارہ سرکاری تھا اور رسائل عام ادبی انداز کے تھے۔ البتہ ان کے شذرات میں جنگی کوائف اور اتحادیوں کے عزائم و کارگزاری پر مخصوص انداز میں تبصرے ہوا کرتے تھے۔ اتنی سی "تلخی" کے لئے اتنی وافر "شیرینی" مہیا اور ضائع کی جاتی تھی۔ ان رسالوں کو دیکھ کر خیال آتا تھا کہ یا تو ان سے وابستگان نے انگریز کو خوب ہی الو بنا رکھا ہے اور اپنی مطلب براریوں کے لئے اسے استعمال کر رہے ہیں یا انگریز از خود اس بظاہر حقیر جنگی پروپیگنڈے کو اتنا وقیع سمجھتا ہے کہ اس قدر گراں مصارف کا متحمل ہو رہا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو جنگ کے دوران میں اس قسم کی "ذہنی تفریح" اس لحاظ سے کم از کم قابلِ فہم تھی کہ جنگی مصائب نے اذہان و اعصاب پر جو خاص قسم کا دباؤ ڈال رکھا تھا یہ "ہلکے پھلکے" رسالے بعض لوگوں کے اس دباؤ اور کوفت کو وقتی طور پر کم کر دیتے تھے۔ اس پر مستزاد جنگی مقاصد کی تبلیغ تھی جو غیر محسوس طور پر ہو رہی تھی۔

لیکن پاکستان میں اس عیاشی اور اسراف کے لئے کیا جواز ہے؟ دہلی کے (یونائیٹڈ پبلیکیشنز کے) مرحوم رسالوں کے ادارہائے تحریر زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھے۔ وہ حضرات اب پاکستان تشریف لے آئے ہیں۔ چنانچہ سوال پیدا ہوا — پاکستان کی گوناگوں مشکلات کا ذرا اندازہ فرمائیے! — کہ ان کی کھپت کیسے ہو۔ اس سوال کا جواب "ما وجدنا علیہا اٰباءنا" سے آگے ان افکارِ نو سے عاری دماغوں میں آ ہی کیا سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستان کی طرف مڑ کر دیکھا اور حل فوراً سامنے آ گیا کہ ان بیکار اداروں کے لئے سابقہ شغل مہیا کر دیا جائے۔ چنانچہ یکم اپریل سے حکومت کے باب عالی کی جانب سے ماہنامہ "ماہِ نو" کا اجرا کر دیا گیا۔ یکم اپریل کی تاریخ میں — شاید نادانستہ طور پر — یہ کنایہ ہے کہ حکومت نے قوم کو "اپریل فول" بنایا ہے۔

'ماہِ نو'[1] اور عام ادبی رسالوں میں بدیہی فرق یہ ہے کہ یہ سفید کاغذ پر چھپتا ہے اور اس کی قیمت آٹھ آنے ہے۔ اس وقت کوئی اردو رسالہ سفید کاغذ پر نہیں چھپ سکتا۔ کیونکہ سفید کاغذ کے استعمال کے لئے حکومت سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے جو دستیاب نہیں ہوتا۔ لیکن اس سرکاری مجلہ کے لئے سفید کاغذ مہیا کر دیا گیا ہے۔ پھر اس کی قیمت نسبتاً بہت کم رکھی گئی ہے۔ گویا حکومت اپنے سرکاری اثر و اقتدار کا ناجائز استعمال کر رہی ہے۔ کارکنانِ رسالہ اور مضامین نگاروں کو بھی معقول معاوضے دیئے جاتے ہیں۔ ایک طرف حکومت عوام پر ٹیکس بڑھا رہی ہے اور دوسری طرف خرچ کی یہ کیفیت ہے کہ بے کار مدوں پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ ہم حکومت سے پوچھتے ہیں کہ ایک ادبی رسالہ کے اجراء سے حکومت نے بالآخر کونسا تعمیری کام کیا ہے؟ کیا اچھے افسانے، معیاری اشعار اور لطیف ادب حکومت کا انحصار Monopoly ہیں؟ کیا غیر سرکاری رسالوں میں یہ خوبیاں مفقود ہوتی ہیں یا پیدا نہیں کی جا سکتیں؟ کیا ڈرامے، افسانے، گیت اور غزلیں قوم کی ان تمام مشکلات کا حل پیدا کر دیں گے جن کا رونا ہر وقت رویا جاتا ہے۔ خدا کے لئے کوئی بتائے تو سہی کہ بالآخر وہ کونسی ضرورت تھی جسے پورا کرنے کے لئے یہ ادبی رسالہ جاری کیا گیا ہے؟ حکومت کی یہ غلط بخشی ہمارے نزدیک اُن قرونِ ماضیہ کی مسرفانہ یاد ہے جب دربارِ شاہی میں خوشامدانہ قصائد کے ایک ایک شعر پر شاہی خزانوں کے منہ کھول دیئے جاتے تھے۔ اور شاعر کا منہ موتیوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ اس زمانہ کی باتیں ہیں جب کسی کو بھوک نہیں ستایا کرتی تھی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ پاکستان میں ہمہ گیر خلفشار ہے۔ لاتعداد مہاجرین کی بحالی، لباس و خوراک کی کمیابی اور گرانی، متوقع بیروزگاری مستقبل سے متعلق عدم اطمینان، غرضیکہ پاکستان کی یہ نومولود مملکت تنوعِ مصائب سے دوچار ہے۔ یہ حکومت اور ملت کے مشترکہ مصائب ہیں۔ ان کا ازالہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حکومت اور ملت یک جان ہو کر مصروفِ کار نہ ہوں۔ حکومت ملت کا اشتراک حاصل کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ اس پر اعتماد کرے اور اسے رازدار بنائے۔ حکومت نے اس ضمن میں کیا کیا؟

صرف یہ:

---

[1] ہم 'ماہِ نو' سے بصد ادب گذارش کرتے ہیں کہ یہ تحریر رسالہ پر تبصرہ نہیں بلکہ حکومت کی پالیسی پر تنقید ہے۔

۱) ایک ادبی مجلہ ماہِ نو جاری کر دیا۔

۲) ایک آدھ پریس کانفرنس میں سرکاری ملازمین سے خطاب کر دیا۔

۳) اخبار ڈان میں حکومت کا نقطۂ نگاہ کے تحت چند مضامین شائع کرا دیئے۔

جب قومیں زندگی کے حقائق کا مقابلہ نہیں کر سکتیں تو ان کی نشاطِ روح شاعری ہوتی ہے۔ شاعری اور زندگی متضاد چیزیں ہیں۔ مسلمان اول و آخر شاعر ہے۔ یوم اقبال پر مشاعرے اور قوالیاں ہوتی ہیں۔ رابطہ عوام شاعری اور ادب لطیف سے ہوتا ہے۔ 'ماہِ نو' ایک شعر ہے! اچھا یا برا؟ نتیجہ ایک ہے! زندگی سے فرار!!

ڈان میں حکومت کی طرف سے جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ حکومت کے ایماء پر نہیں ہوئے بلکہ اس طرح اخبار مذکور نے اپنے صفحات میں مزید دلچسپی کی صورت پیدا کی۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ حکومت نے اس موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس نے دفتری قسم کے چند بیانات دیدیئے جس میں خودستائی تھی اور تعلّی، اور کہیں کہیں تکلفانہ انکسار تاکہ تعلّی کی ناگواری گراں نہ گزرے۔

ہم حکومت سے پھر گذارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو جمہور کی آواز بنائے۔ ملت کو یقین دلائے کہ حکومت ملت کی ہے اور خود اس کا ثبوت دے کہ وہ ملت کو اپنی ملت سمجھتی ہے۔ موجودہ طریقے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کے نہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے محکمہ اطلاعات کو زندہ مثال اور قومی شعبہ کی حیثیت سے سرگرم کار ہونا چاہیئے اسے حقائق کو پیش کرنا اور حقائق کا اعتراف کرنا چاہیئے۔ اب حقائق سے کھیلنے یا چشم پوشی کا وقت نہیں۔ پاکستان ایک حقیقت ہے وہ افسانہ ہے، نہ شعر۔ زندگی بجائے خود نہ افسانہ ہے، نہ شعر۔ ہم میدانِ جنگ میں ہیں۔ زندگی سعی پیہم ہے اور جہاد مسلسل۔ شاعری، زندگی کے حقائق سے گریز کا نام ہے۔ عرصۂ حیات میں جیت مردانِ کار کی ہوتی ہے اور نام بھی مجاہدوں اور سرفروشوں کا ہی بلند ہوتا ہے۔ پاکستان ابھی 'ماہِ نو' ہے، لیکن وہ شعر و ادب کا مرقع نہیں، نہ افسانوں کا پلندہ۔ بلکہ اس تاریخی حقیقت کا حل کہ "خنجرِ ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا" اس مستقبل کا آئینہ دار کہ — در سینۂ تو ماہِ تمامے نہادہ اند — اور اس قرآنی صداقت کا مصداق کہ

ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وا تواالزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر

حکومت کو اگر رسالوں سے اس قدر شغف ہے تو وہ ایک ایسے رسالے کی کمی کو پورا کرے جو پاکستان سے متعلق ضروری دستاویزات، معلومات اور اعداد و شمار پیش کرے۔ پاکستان سے متعلق معلوماتی مضامین شائع کرے جن کی ضرورت اندرونِ پاکستان بھی ہے اور بیرونِ پاکستان بھی۔

'ماہِ نو' کے مدیر کے پاس اچھا قلم ہے، لیکن وہ اسے بہرکیف اسی مصرف میں لا سکتا ہے جو مصرف حکومت اس کے لئے متعین کرے۔ وہ ایک اچھا معمار ہے آپ اس سے جی چاہے مندر بنوا لیجئے، جی چاہے مسجد۔ ہم اربابِ حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ قوم کے روپیہ اور فاضل ادیبوں کی قابلیتوں کو شاعری اور افسانہ نگاری کے 'طاؤس و رباب' میں ضائع نہ کرے بلکہ اس سے تعمیرِ ملت کا کام لے۔

کیا حکومت، ان گذارشات کی روشنی میں، اپنے فیصلہ اور اقدام پر نظرِ ثانی کرے گی؟

پارٹیاں کس طرح ختم ہو سکتی ہیں؟

۲۰۔ اپریل کو پشاور کے ایک اجتماع عام کو مخاطب کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے اس دور نازک سے متعلق انتباہ فرمایا جس سے پاکستان دوچار ہے اور اس امر پر زور دیا کہ موجودہ قومی ایمرجنسی میں صرف ایک سیاسی پارٹی ہونی چاہیئے۔ چنانچہ آپ نے مشورہ دیا کہ وہ (یعنی عوام) ان حشرات الارض قسم کی سیاسی جماعتوں کا خیال چھوڑ دیں جو سابقہ خلاف پاکستان عناصر کی شرمندۂ تنظیم ہیں۔ لہٰذا

آپ متحد ہو کر مسلم لیگ سے وابستہ رہیئے کیونکہ تنہا اسی جماعت نے پاکستان حاصل کیا ہے۔

اس فرمودہ کا لب لباب یہ ہے کہ پاکستان میں ایک پارٹی ہونی چاہیئے جو سوائے مسلم لیگ کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کیونکہ اسی نے پاکستان حاصل کیا ہے۔ حصولِ پاکستان سے پیشتر ملت اسلامیہ ہند یا مسلم لیگ کو ایک سمجھا جاتا تھا۔ خود مسلم لیگ کا دعویٰ یہی تھا۔ لہٰذا اب یہ کہنا کہ تنہا مسلم لیگ نے پاکستان حاصل کیا ہے صحیح ضرور ہے لیکن اس سے صحیح تر یہ ہے کہ ملت نے پاکستان حاصل کیا ہے۔ اب مسلم لیگ اور ملت میں یہ لفظی فرق کیوں روا رکھا جا رہا ہے؟ کیا اس لئے کہ ملت کی جدوجہد کو تنہا مسلم لیگ کی جدوجہد کہہ کر آئندہ کے لئے جماعتی کامیابی کے امکانات روشن کئے جائیں؟

یہ تقریر ایک بنیادی مسئلہ سے متعلق ہے جس پر عمومی بحث ہم سابقہ اشاعت میں کر چکے ہیں۔ محترم قائدِ اعظم پاکستان کے موجودہ گورنر جنرل ہیں اور اپنی بلند ترین شخصیت کے پیش نظر نئے آئین میں وہ امیرِ پاکستان ہوں گے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی شخصیت کا مشورہ کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا قائدِ اعظم کی انفرادی خواہش ہے کہ پاکستان میں ــــ کم از کم جب تک ایمرجنسی کی صورت باقی ہے ــــ صرف ایک پارٹی ہو

یا یہ موجودہ اور آئندہ کے قائدِ ملت کا ناطق فیصلہ ہے۔ خواہش کی صورت میں تو معاملہ ختم نہیں ہو جاتا اور رائے کا حق اور موقع باقی رہتا ہے۔ البتہ فیصلہ کی صورت میں دیکھنا ہوگا کہ مسلم لیگ کے علاوہ دیگر جماعتوں کو حکماً بند کر دیا جائے گا یا انھیں ایسی مراعات نہیں دی جائیں گی کہ وہ مسلم لیگ کی قابلِ ذکر حریف بن سکیں۔ دونوں حالتوں میں حکومتِ وقت اس الزام سے بچ نہیں سکے گی کہ وہ آزادی رائے اور حریت فکر پر ناجائز پابندیاں عائد کر رہی ہے اور ایک فکری استیلاء و آمریت مسلط کر رہی ہے۔ آئین و قواعد جمہوریت کی رو سے یہ کسی طرح مستحسن نہیں ہو سکتا کہ ایک پارٹی کو قائم رکھا جائے اور باقی پارٹیوں کو جبراً ختم کر دیا جائے۔

صرف ایک ہی پارٹی کا وجود آمریت کا دوسرا نام ہے۔ اٹلی، جرمنی اور روس میں یہی صورتِ حال تھی یا ہے۔ چنانچہ یہ حکومتیں خالصۃً آمرانہ رہیں یا ہیں۔ ارباب مسلم لیگ یقیناً اس قسم کی آمریت کے خواہشمند نہیں۔ اس سے بہتر قسم کی فضا ترکی میں تھی۔ وہاں الغائے خلافت اور قیام جمہوریت (۱۹۲۳ء) کے ساتھ ایک ہی پارٹی کے وجود کو قانونی حیثیت دی گئی اور دیگر جماعتوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ ۱۹۴۶ء میں پہلی مرتبہ یعنی کوئی تیئس سال بعد دوسری جماعتوں کو سیاست میں دخیل ہونے کی اجازت دی گئی۔ گو تفصیلی اطلاعیں بیرونِ ترکی نہیں آئیں تاہم جو خبریں آتی رہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ جو مخالف جماعتیں میدانِ انتخاب میں آئی ہیں ان کی وہی مشکلات و شکایات ہیں جو گذشتہ انتخابات عامہ میں پنجاب مسلم لیگ کو یونینسٹ حکومت کے خلاف تھیں۔ وہی سرکاری اقتدار کا ناجائز استعمال، مخالف جماعت کی راہ میں طرح طرح کے موانعات پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ

ترکی کا ایک پارٹی کا تجربہ کس قدر کامیاب رہا؟ اس کے متعلق وثوق سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ کوئی مستند شہادت اس کے متعلق موجود نہیں۔ البتہ یہ حقیقت کہ دوسری جماعتوں نے برسرِ اقتدار پارٹی کے خلاف طرح طرح کے الزامات لگائے اس کی غمازی کر رہی ہے کہ صورتِ حال خاطر خواہ نہیں تھی۔ دوسری پارٹیوں کا معرضِ وجود میں آجانا اور ان کا حاکم پارٹی کی مخالفت میں اس اشتداد کا اظہار کرنا اسی کا آئینہ بردار ہے کہ انھوں نے تیئس برس جبر و اکراہ سے گزارے اور قانون کے ڈر سے خاموش رہے۔

ہوسکتا ہے کہ ترکی کا نظامِ حکومت کامیابی سے چلتا رہا ہو لیکن وہ کامیابی اعتباری اور اضافی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ نظام اسلامی نہیں لہٰذا ہمارے لئے قابلِ تقلید مثال نہیں۔

جمہوری طرزِ حکومت کی صحیح مثال کہ جس کی اساس پارٹی حکومت پر ہے، انگلستان ہے، جہاں ان دنوں حزب عمال برسرِ اقتدار ہے۔ پارٹی گورنمنٹ کا یہ خاصا ہے کہ حکومت صرف ایک ہی پارٹی کے افراد تک محدود رہتی ہے۔ خواہ وہ افراد قابلیت، اہلیت اور تجربہ کے لحاظ سے ان سے کمتر ہی کیوں نہ ہوں جو اس پارٹی کی حدود سے باہر ہیں۔ موجودہ حزب عمال اوسط درجہ کی قابلیت کی جماعت ہے۔ اس جماعت کے علاوہ انگلستان میں ایسے حضرات موجود ہیں جو حکومت کا تجربہ اور اہلیت کہیں زیادہ رکھتے ہیں۔ وہ انگلستان اور شاہِ انگلستان کے ویسے ہی وفادار ہیں جیسے ارکان حزب عمال۔ لیکن انھیں شریک حکومت اس لئے نہیں کیا جاتا کہ حاکم جماعت کے ارکان نہیں۔ ان کا ذاتی جوہر اور قابلیت ملک اور قوم کے کام اس لئے نہیں آسکتا کہ وہ ایک ایسی جماعت کے ارکان ہیں جو انتخابات میں نسبتاً کم ووٹ لے سکی ہے۔

پارٹی گورنمنٹ میں یہی ایک عیب نہیں کہ معیارِ انتخاب جوہرِ ذاتی کے بجائے رکنیت جماعت ہوجاتا ہے بلکہ حزب مخالف کا فریضہ محض مخالفت رہ جاتا ہے۔ چونکہ اس کے پیشِ نظر مقصد یہ ہوتا ہے کہ برسرِ اقتدار پارٹی کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کرے اس لئے وہ صالح یا تعمیری تنقید کے بجائے ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتی ہے کہ مخالفت کی خاطر مخالفت کرے اور جا و بے جا عیب جوئی کرکے حکومت کو بدنام و ناکام کرے۔ حزب مخالف کا منصب تنقید و تعاون لہٰذا اصلاحِ نظام قومی نہیں رہتا بلکہ جب وہ تنقید کرتی ہے تو اس کی ایک آنکھ ووٹ دینے والوں پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پارلیمانی مباحثوں میں بیشتر افراط و تفریط ہوتی ہے اور اعتدال و توازن غائب ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس برسرِ اقتدار پارٹی اس معروضہ کو کبھی فراموش نہیں کرتی کہ حزب مخالف، مخالفت برائے مخالفت کرتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو حزب مخالف کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتی بلکہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر اس کی تنقید کو ٹھکرا دیتی ہے۔ وہ غیر ارکان کو نہ محض حکومت سے بے دخل کرتی ہے

بلکہ بدستور اسی کوشش میں رہتی ہے کہ وہ بے دخل رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی حکومت کے اقدامات و حکمتِ عملی میں خلوص و دیانت مفقود ہوتے ہیں۔ اس کا پیش نہاد استحکام و استمرار حکومت و اقتدار ہوتا ہے۔

مزید برآں حکومت اپنے آپ کو اپنی پارٹی کے سامنے جواب دہ سمجھتی ہے نہ کہ عمومی طور پر ملک و قوم کے سامنے۔ خود پارٹی میں یہ جانبداری پائی جاتی ہے کہ اس کی منتظم Executive جسے حکومت کا محاسب کہا جاتا ہے اس کے اسقام و عیوب کو چھپاتی ہے وہ چھپاتی ہی نہیں بلکہ انھیں حق بجانب قرار دیتی ہے۔ پارٹی کے نام نہاد محاسبہ کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ پارٹی کے کوئی سرگرم ارکان برسرِ اقتدار ارکان کی جگہ لینے کے متمنی ہوتے ہیں۔ چنانچہ حکومت پر تنقید ایسے ارکان جماعت کی طرف سے شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے حکومتی — وزارتی — بحران پارٹی افراد کے اِدھر اُدھر کر دینے سے طے ہو جاتے ہیں۔ معترضین کو جب عہدے میسر آجاتے ہیں تو ان کے اعتراضات ختم ہو جاتے ہیں۔

پارٹی طرزِ حکومت میں قوم کا ایک مذموم دوری جدوجہد میں گرفتار ہو جانا ناگزیر ہے۔ اس بیج کا بھی پھل ہے۔ قوم اس سے اپنی وحدت اور یکسانیت کھو بیٹھتی ہے اور کم از کم تین گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ ۱) حکومتی گروہ۔ ۲) پارٹی کی منتظم Executive ۳) مخالف پارٹی یا پارٹیاں۔ ان کے باہمی رشتہ پر عمومی تبصرہ سطورِ بالا میں ہو چکا ہے۔

حزبِ مخالف کے وجود سے ایک لحاظ سے بزمِ سیاست میں ہمہمی اور رونق رہتی ہے، کیونکہ مخالف پارٹی اپنی تنظیم اور مدِ مقابل کی تخریب میں لگی رہتی ہے اور اس دھن میں رہتی ہے کہ وہ بھی کافی قوت مجتمع کر کے حکومت بن سکے گی۔ لیکن اگر مخالف جماعت کو خارج از بحث کر دیا جائے تو یہ رونق بھی ختم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جو افراد حکومت میں شریک نہیں ہوں گے وہ اپنے آپ کو حکومت سے غیر متعلق سمجھیں گے اور اس سے دور تر ہوتے جائیں گے۔ چونکہ حکومت کے کاروبار میں شریک ہونے یا اس پر اثر انداز ہونے کی شرط پارٹی کی رکنیت ہے جو انھیں کسی وجہ سے منظور نہیں اس لئے حکومت میں ان کی دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ ان افراد میں کے ذی علم یا تو سڑی (Cynic) بن جائیں گے یا 'باغی'۔

ان گذارشات کی روشنی میں پاکستان کے انتخاباتِ نو کا تصور بے کیف اور بے روح ہو جاتا ہے میدان انتخاب میں ایک مسلم لیگ ہوگی۔ لیگ عاملہ یا منتظمہ ہر حلقے میں اپنے امیدوار نامزد کر دے گی۔ کوئی منظم جماعت اس کی حریف نہیں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ انفرادی طور پر بعض حلقوں میں بعض من چلے مقامی تعصبات کی بنا پر مسلم لیگی امیدواروں کی مخالفت کریں۔ جہاں کہیں بھی کسی نے ایسا کیا وہ مقامی تعصب پر ہی حریف کو پچھاڑنے کی کوشش کریں گے کیونکہ وہ سیاسی جماعت کی تشکیل نہیں کر سکتے اور اپنا کوئی بلند عمومی سیاسی پیش نہاد نہیں رکھ سکتے۔ مقامی تعصبات میں نسلی یا خاندانی عنصر غالب ترین ہوگا۔ یہ عوامل اب متروک ہو چکے ہیں۔ دنیا ان سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اب یہ گڑے مردے اکھیڑے نہیں جا سکتے۔ ان کو اکھیڑا بھی نہیں جانا چاہیئے۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دیہات میں یہ تنگ دائرے اپنا اثر کھو چکے ہیں — اور یہ حقیقت ہے کہ اب انھیں از سرِ نو تقویت نہیں پہنچائی جا سکتی — تو پھر کیوں نہ بلند تر مقاصد سے وابستگی پیدا کی جائے اور ایسی فضا پیدا نہ ہونے دی جائے جس سے ایسا احتمال بھی پیدا ہو۔ کیوں نہ ہم خاندان اور نسل کے بتوں کو توڑ کر ملت سے اعتصام و تمسک کریں کہ نوعِ انسان ایک وحدت ہے اور ناقابلِ تقسیم۔

بہر حال ایشوع کچھ بھی ہو مسلم لیگ کی مخالفت حقیر اور ناقابلِ اعتنا ہوگی۔ ایسے میں انتخابات کس قسم کے ہوں گے؟ بس یہ کہ عاملہ نے کس کو نامزد کر دیا اور حریف کی عدم موجودگی میں وہ "بلا مقابلہ" کامیاب ہو گیا۔ اگر ایسا ہے۔ اور ان حالات میں ایسا ہی ہوگا۔ تو پھر سیاسی انتخابات و تشکیل حکومت ایک مذاق بن کے رہ جائیں گے۔ کیا محض ایک سیاسی پارٹی کو یہ دائمی حق نہیں مل جائے گا کہ وہ من مانی کارروائی کرے اور خواہی نخواہی حکومت پر مسلط رہے؟ ہر قوت کا نشہ خطرناک ہوتا ہے اور مطلق قوت کا نشہ خطرناک ترین ہوتا ہے۔

مسلم لیگ کے متعلق یہ اہم حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ قبل از تقسیم ہند اور بعد از تقسیم کی مسلم لیگ میں بڑا فرق ہے۔ تقسیم سے پیشتر مسلم لیگ اور ملت میں کوئی فرق نہیں تھا اور ملت ہمہ تن مسلم لیگ سے وابستہ تھی۔ لیکن مسلم لیگ کے حکومت سنبھالنے یعنی ہندوستان میں عارضی حکومت میں شریک ہو جانے اور پھر پاکستان میں مکمل حکومت بن جانے سے ملت کی رائے بدل گئی ہے اور اب ملت کی

مسلم لیگ سے وابستگی ویسی نہیں رہی جیسی پہلے تھی۔ طلوع اسلام میں متعدد مرتبہ اس ضد کی طرف توجہ دلائی جا چکی ہے جو حکومت اور ملت کے مابین واقع ہو چکا ہے اور دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ اس بُعد و مغائرت کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ ملت اپنے آپ کو شریکِ حکومت نہیں سمجھتی۔ وہ تجربہ سے اس ناقابلِ تردید نتیجہ تک پہنچ چکی ہے کہ حکومت اس کی اپنی نہیں۔

محترم قائداعظم کی جس تقریر کا حوالہ ہم نے آغاز کلام میں دیا ہے اسی میں انھوں نے یہ بھی فرمایا۔

یہ حکومت مختلف ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ حکومت نہ زید کی ہے، نہ بکر کی۔ یہ حکومت آپ کی ہے۔

موجودہ حکومت زید و بکر کی ہو یا نہ ہو، یہ حقیقت ہے کہ یہ مسلم لیگ کی حکومت ہے۔ مسلم لیگ اپنا بہت سا اعتماد کھو چکی ہے۔ اب وہ اتنی ہر دلعزیز نہیں رہی جتنی کہ ہوا کرتی تھی۔ اسے دوبارہ ہر دلعزیز اور واحد نمائندہ جماعت بنانے کا یہ طریقہ کہ دیگر جماعتوں کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا جائے یا ان کو مطلوبہ مراعات نہ دی جائیں، غیر آئینی اور غیر جمہوری ہے۔ ہم امیر جنسی کے ڈر سے ایک ایسی طرزِ حکومت کو رائج بلکہ مسلط کر رہے ہیں جو ملت کو ایک مصیبت سے نکال کر دوسری مصیبت میں مبتلا کر دے گی۔ اس پارٹی آمریت کا نتیجہ ہمہ گیر بدنظمی اور فوضویت (Anarchy) کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا۔ قوم کا قابل قدر طبقہ اپنے آپ کو ناخواندہ سمجھنے پر مجبور ہوگا اور قوم ان کی ذہنی اور قلبی متاع سے محروم رہ جائے گی۔

ہم بدقسمتی سے ایک دوری استدلال کا شکار ہیں جہاں علت و معلول میں امتیاز مشکل ہے۔ کیونکہ ہر معلول دوسرے نتیجہ کی علت ہے۔ ہمیں اس سے نکل کر 'صراط مستقیم' کی طرف آنا چاہیئے کہ قومی انا کے صحیح اظہار کی یہی صورت ہے۔ ہم چند افراد کے انا کے اظہار کی سبیل تو پیدا کر رہے ہیں لیکن اجتماعی انا کو محبوس و مقید کر رہے ہیں۔ یہ صراط مستقیم وہی ہے جس کا خاکہ ہم سابقہ اشاعت میں پیش کر چکے ہیں، یعنی یہ کہ کوئی سیاسی جماعت نہ ہو اور ملت کے تمام افراد ایک دوسرے کے ممد و معاون بن کر تشکیل حکومت کریں۔ کوئی ایک فرد بھی اس نظام سے خارج نہ ہو۔ وہ اپنی امکانی قدرت کے مطابق نظام میں شریک ہو اور نظام اس کا ضامن ہو کہ اس کے انا کے کما حقہٗ اظہار کے مواقع مہیا کئے جائیں گے۔

ہم نے جو کچھ سابقہ اشاعت میں لکھا تھا اور جسے اوپر دہرایا ہے اسے ایک مرتبہ پھر سامنے لائیے۔ ہمارے اربابِ حل وعقد کا ارشاد ہے کہ مختلف پارٹیوں کا وجود مملکتِ پاکستان کے لئے سخت خطرناک ہوگا۔ بالکل بجا اور درست۔ لیکن وہ اس کا علاج کیا بتاتے ہیں؟ یہ کہ ان کی اپنی پارٹی (مسلم لیگ) موجود رہے اور باقی اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی بننے نہ پائے اور اگر بن جائے تو باقی نہ رکھی جائے۔ معترضین کا اعتراض یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پاس کون سی آسمانی سند ہے کہ اس کا وجود ضرور رہے اور اس کے علاوہ کوئی اور پارٹی نہ رہے۔ آپ غور کیجئے تو دنیا میں پارٹی بازی اور گروہ بندی کی بنیاد ہی اس غلط اصول پر ہے کہ ایک پارٹی یہ چاہتی ہے کہ میرا وجود ضرور رہے، لیکن کوئی دوسری پارٹی میرے مدمقابل نہ آئے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتی ہے کہ میں حق پر ہوں اور دوسری کوئی پارٹی حق پر نہیں۔ لیکن آپ سوچئے تو بعینہٖ یہی دلیل اس پارٹی کے مدمقابل دوسری پارٹی دے رہی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طرح بیسوں پارٹیاں وجود میں آجاتی ہیں اور ایک دوسرے کی ضد قائم رہتی ہے، غور کیجئے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ پارٹیوں کے وجود کو ختم کرنے کا یہ طریق نہیں کہ آپ اپنی پارٹی کو برسرِ حق قرار دے کر اس کے وجود کو قائم رکھیں اور باقی پارٹیوں کو باطل ٹھہرا کر ان کا استیصال کرنے لگیں۔ اس طرح سے پارٹیوں کا وجود کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اس کے ختم کرنے کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ وہی طریق ہے جسے قرآن نے تجویز کیا ہے — کہ کسی پارٹی کا وجود ہی باقی نہ رہے۔ جب پارٹیاں ختم ہو جائیں گی تو باقی ملت رہ جائے گی۔ جس طرح، جب فرقے ختم ہو جائیں گے تو باقی مسلمان رہ جائیں گے۔ اور آگے بڑھئے تو — جب قومیں ختم ہو جائیں گی تو باقی انسانیت رہ جائے گی — یہی قرآن کا مقصود ہے۔

آپ نے دیکھا ہے کہ آپ کے اس دعوے کا توڑ کہ مسلم لیگ، ملت کی نمائندہ جماعت ہے، خان عبدالغفار نے کیا تجویز کیا ہے۔ اس نے اپنی مجوزہ جماعت کا نام (Peoples Party) کے بجائے Peoples Organisation رکھ لیا ہے۔ آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ کی پارٹی ملت کی نمائندہ ہے۔ اس کا دعویٰ ہوگا کہ اس کی پارٹی ملت کی نمائندہ ہے۔ قولِ فیصل شاید اراکین کی تعداد قرار پا جائے۔ اس باب میں جو زیادہ جدوجہد کرے وہی کامیاب ہو جائے گا۔ اور پھر معاملہ یہیں تک تھوڑا

رہ جائے گا۔ بیسوں پارٹیاں وجود میں آئیں گی اور ہر ایک کا یہی دعویٰ ہوگا کہ

آؤ لوگو کہ یہیں نورِ خدا پاؤ گے

پھر ہر پارٹی کا اپنا اپنا عسکری بازو بھی ہوگا۔ خان عبدالغفار خاں کی تجویز ہے کہ ان کے سرخپوشوں کی تحریک تمام پاکستان کو محیط ہو جائے۔ آپ مسلم لیگ کے رضاکاروں کو ہمہ گیر بنانے کی کوشش کریں گے یہ دونوں کوششیں محض پارٹی بازی کی جنگ ہوگی حالانکہ اب نہ سرخپوشوں کی ضرورت باقی ہے نہ مسلم لیگ کے رضاکاروں کی۔ اب صرف پاکستان کی سپاہ کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ تنخواہ دار ہو یا رضاکار۔ اور بس۔

اس حقیقت کو بھی ایک مرتبہ پھر سامنے لے آئیے جسے ہم نے سابقہ اشاعت میں پیش کیا تھا کہ مسلم لیگ بہت زور مارے گی تو دس لاکھ ممبر بھرتی کر لے گی۔ پچاس لاکھ کر لے گی۔ لیکن پاکستان کی مجموعی آبادی کے مقابلہ میں یہ جماعت بہرحال اقلیت کی حیثیت رکھے گی۔ اب جو حکومت بنے گی تو اس اقلیت کی بنے گی۔ اکثریت اپنے آپ کو حکومت سے الگ تصور کرے گی۔ وہ یا عضو معطل بن کر بیٹھ جائے گی یا مقابلہ میں دوسری پارٹیاں بنانے میں مصروف ہو جائے گی۔ دونوں صورتیں قوم کے لئے خطرناک ہونگی۔ ہم جانتے ہیں کہ ارباب مسلم لیگ کو چونکہ لیگ کی مقبولیت پر یقین ہے اور اس لئے اپنی حکومت کی تشکیل کے امکانات پر اعتماد، اس لئے وہ ہماری اس تجویز کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھیں گے۔ لیکن ہم ان سے باادب گذارش کریں گے کہ وہ اپنی عارضی حکومت کے امکانات ہی کو سامنے نہ رکھیں، استحکام مملکت اور تعمیرِ ملت کے بلند ترین مقاصد کو بھی پیشِ نظر رکھیں اور اس کی یہی صورت ہے کہ

تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

پارٹیوں کو توڑ کر جذبِ ملت کر دیجئے۔ اجزا کو کل میں سمو دیجئے۔ افراد کو کارواں، قدموں کو صحرا اور قطروں کو دریا میں تبدیل کر دیجئے۔ یہ کیفیت پیدا کر دیجئے کہ

ایک ہوں سارے حرم کی پاسبانی کے لئے

اور پھر دیکھئے کہ آپ کی ملت کس طرح حدود فراموش اور قیود ناآشنا ہو کر فضائے عالم کی ہمہ گیر پہنائیوں پر چھا جاتی ہے۔ اس کا عمل طریق بھی وہی ہے، جس کا ذکر ہم نے سابقہ اشاعت میں کیا تھا۔ یعنی پاکستان کی تمام آبادی کو ابتدائی وحدتوں (Primary Units) میں بانٹ دیجئے۔ ہر وحدت (وہ دس کی ہو یا سو کی) بجائے خویش ایک مملکت اور حکومت ہو۔ اپنے اپنے حلقہ کے راعی۔ ایک دوسرے کے رفیق و معاون۔ ہر ایک کی استعداد و استطاعت سے باخبر۔ تمام کے تمام ایک نصب العین کے حصول میں منہمک، ہر فرد ایک ہمہ گیر کُل کا جزلاینفک ہونے کی جہت سے کُل کے مدوجزر میں برابر کا شریک اور اس طرح

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

کی زندہ تصویر۔ یہ ابتدائی وحدتیں پھیلیں تو پوری مملکتِ پاکستان بن جائیں اور ساری کی ساری مملکت پاکستان سمٹے تو ہر وحدت میں اس طرح مرتسم ہو جائے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو جو شخص اس وحدت کو توڑ کر پارٹی سازی کا خیال بھی دل میں لائے اسے "شرک فی الملت" کے جرم عظیم کے سزا میں کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے۔

یہ ہے صحیح طریقہ پاکستان سے پارٹیوں کے وجود کو ختم کرنے کا۔ اور یہی ہے طریقہ ملت کے ہر فرد کو عملاً محسوس کرانے کا کہ اب حکومت کسی اور کی نہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہر سمجھنے والا یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!

قرآنی تعلیم

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی)

طلوعِ اسلام کے گزشتہ پرچہ میں میں نے لکھا تھا کہ ملت اسلامیہ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی خلافت قائم کرے۔ لیکن یہ اجمالی اشارہ تھا جس میں اس کی وضاحت نہیں تھی کہ کیوں خلافت قائم کرنا فرض ہے اور کس طرح یہ خلافت قائم کی جاسکتی ہے؟ اس لئے اس کی تفصیل بیان کرنی ضروری ہے۔

اس بات کو ہر مسلمان جانتا بلکہ دل سے مانتا ہے کہ اسلام کی بنیاد توحید پر ہے۔ توحید کا مفہوم صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات اور صفات کے لحاظ سے واحد ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ صرف وہی حاکم ہے اور صرف اسی کی اطاعت امت کا فریضہ ہے۔ جس طرح اس کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک ماننا شرک ہے اسی طرح اس کے سوا کسی کو حاکم ماننا یا کسی کی اطاعت کرنا بھی اس کی توحید کے خلاف ہے۔

خلافت راشدہ تک اللہ ہی کی حکومت اور اسی کی اطاعت رہی۔ ان خلفاء کرام میں سے کسی نے بھی اپنی اطاعت نہیں چاہی بلکہ امت سے اللہ ہی کی اطاعت لیتے رہے۔ اور ان کے زمانوں میں ساری ملت اعتقاداً اور عملاً سچی موحد تھی۔ لیکن ان کے بعد جو لوگ سریر آرائے خلافت ہوئے ان کے شخصی اور خاندانی اغراض بھی حکومت میں شامل ہوگئے جن کو پورا کرنے کے لئے انھوں نے بیت المال اور فوج پر اپنا قبضہ جما کر آزاد مسلمانوں کو اپنی رعایا بنا لیا جس سے حکومتِ الٰہی انسانی حکومت میں تبدیل ہوگئی۔

خلیفہ جو رسول کا جانشین تھا اس کا فریضہ ملت کے دین اور دنیا دونوں کی قیادت اور رہنمائی تھی۔ لیکن ان مستبد خلفاء نے سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے خزانہ اور لشکر کو اپنے اقتدار کے لئے

کافی سمجھا اور دینی قیادت علماء کے لئے چھوڑ دی۔ اس طرح ملت کی دنیاوی سیاست اور دینی قیادت جن کا مرکز ایک تھا اب الگ الگ حصوں میں تقسیم ہوگئی اور اس میں لامرکزیت آگئی۔

یہ خلفاء سلطنت کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھکر اپنے خاندان بلکہ اپنی اولاد میں محدود رکھنے کی کوشش میں لگ گئے اور وہ حکومتِ الٰہی جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں سکھایا اور رسول نے اپنے عمل سے اس کو قائم کرکے دکھایا اور خلفاء راشدین نے اسی منہاج پر حکومت الٰہی کو چلا کر ملت کو بامِ عروج تک پہنچایا انسانی حکومت بن گئی جس کی بنیاد دنیا کی اور قوموں کی سلطنتوں کی طرح قوت اور تغلب پر تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خالص اللہ کی اطاعت سے ملت کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

قوت اور تغلب ایسی چیزیں ہیں جن کو دوسرے لوگ بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا اور مسلمانوں کے جس جس خاندان یا جماعت یا قوم نے قوت پیدا کی حکومت کے اقتدار کے لئے اس کو استعمال کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے خود مسلمانوں میں جن میں باہمی خونریزی سخت حرام ہے، آپس میں جنگ و پیکار کا ایک لامتناہی سلسلہ چھڑ گیا یہاں تک کہ تمام امت چھوٹی چھوٹی حکومتوں اور سلطنتوں میں منقسم ہوگئی اور اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ آخر میں غیر مسلم اقوام نے بھی جب قوت پیدا کی تو یہ جزوی اسلامی حکومتیں ان کا مقابلہ نہ کر سکیں اور ملت کا بڑا حصہ مشرق سے مغرب تک خوار و زبوں اور ذلیل و رسوا ہو کر کفار کی حکومت میں آگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد جب حکومتِ الٰہی جاتی رہی اور ملت انسانوں کی محکوم اور مطیع ہوگئی اس وقت سے اجتماعی اسلام ختم ہوگیا اور صرف انفرادی اسلام باقی رہ گیا۔

دوسری طرف علماء جن کے حصہ میں ملت کی قیادت آئی وہ بھی اس کی تفریق میں مسلم سلاطین سے پیچھے نہیں رہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ مختلف دیار و امصار میں تھے اور ہر ایک کا طریقۂ فکر الگ الگ تھا۔ اس وجہ سے ان کے اقوال میں اختلافات ہوئے۔ ان اختلافات کے رفع کرنے کے لئے کوئی مرکز نہ تھا اس لئے انھوں نے سند کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو مرکز بنا کر روایات کا سلسلہ جاری کیا۔

حیرت یہ ہے کہ کیونکر ان کے ضمیر نے ان کو اجازت دی کہ ان روایات کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پانچ پانچ اور چھ چھ بلکہ اور بھی زائد واسطوں سے ان تک پہنچی تھیں دینی حجت بلکہ قرآن کے برابر مان لیں۔

ان روایات کی بلا استثنا صورت یہ ہے کہ میں نے سنا زید سے۔ اس کو خبر دی تھی عمرو نے اس نے سنا تھا بکر سے اس سے کہا تھا خالد نے اس سے بیان کیا تھا اصغر نے اس نے سنا تھا اکبر سے الخ۔ ایسی خبر۔ در خبر۔ در خبر۔ در خبر۔ در خبر پر کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو نہ علم ہے نہ شہادت ہے۔ اور کوئی علمی یا عقلی دلیل اس کے یقینی ہونے پر قائم ہی نہیں کی جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کے رواۃ جانچے ہوئے تھے اور سچے لوگ تھے۔ لیکن یہ ان کا اعتبار بھی سنا سنایا ہوا ہے۔ پھر ان کو معتبر مان بھی لیا جائے تو کیا انسانی سہو و خطا غلطی و غلط فہمی و نسیان و ذہول سے بھی وہ بری تھے؟ ایسی صورت میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر تمہارے کہنے کے مطابق وہ معتبر لوگ تھے تو ممکن ہے کہ ان کی روایتیں صحیح ہوں گی۔ یقین کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ بلکہ ان کے مان لینے میں یہ خطرہ ہے کہ ان میں سے کچھ حدیثوں کے متعلق قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ نہ فرما دیں کہ یہ میرا قول نہ تھا۔ یا میں نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے۔ یا میرے کہنے کا یہ مطلب نہ تھا۔ پھر کون ہے جو جواب دینے کی جرأت کرے گا اور پکڑ پکڑ کے ان کے راویوں کو لائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے تم کو حکم دیا تھا۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا

اس کے پیچھے نہ چل جس کا تجھکو علم نہیں۔ کیونکہ سمع اور بصر اور قلب ہر ایک سے اس کی بابت سوال کیا جائے گا۔

پھر تم نے ان غیر یقینی روایتوں کو کیوں دین بنا لیا جس کی بنیاد صرف سماعت پر ہے اور بصر اور قلب کی شہادت مفقود ہے۔ کیونکہ نہ تم نے ان کے راویوں کو دیکھا نہ ان کے اوپر یا ان کی روایتوں پر میں نے تم کو ایمان لانے کا حکم دیا تھا۔ اس وقت اللہ اور رسول کے سامنے جواب دہی کتنی مشکل ہوگی اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔

الغرض ان غیر یقینی باتوں کو حجت دینی قرار دے کر ان علماء نے قرآن پر جو نور مبین اور مکمل کتاب ہے حجابات ڈال دیئے اور اس کو روایات میں دفن کر دیا۔ یہاں تک کہ روایات سے آیات کو منسوخ بھی کرنے لگے۔ پھر زیادہ تر ان میں روایات سے قیاس کر کے مسائل استنباط کئے اور فقہیں مرتب کیں۔ یہ فقہیں بھی جمہوری

نہیں بلکہ شخصی ہیں۔ ائمہ فقہ کے الگ الگ درس تھے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کے ساتھ یہ مسائل مرتب کیے۔ اس طرح فقہیں بھی الگ الگ ہوگئیں، اور امت ٹولیوں میں بٹ گئی۔

الغرض حدیثوں نے بھی امت میں تفرقے پیدا کیے اور فقہیں بھی تشتت کا باعث ہوئیں۔ اگر خلیفہ وقت ملت کا دینی مرکز بھی ہوتا تو یہ افتراق اس میں نہ پیدا ہوتا۔ کیونکہ نہ اس قسم کی روایت در روایت در روایت حدیثیں بنتیں نہ شخصی فقہیں کوئی قیمت حاصل کرتیں۔ بلکہ قرآن سے استنباط کر کے صرف ایک جمہوری فقہ بنتی جس میں زمانہ کی ضروریات کے مطابق اصلاحیں اور ترمیمیں ہوتی رہتیں۔ اب وہ ملت جس کو اللہ نے تعلیم دی تھی کہ

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

سب کے سب اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو اور جدا جدا فرقے نہ بناؤ۔

دنیاوی لحاظ سے سینکڑوں سیاسی منطقوں میں بٹی ہوئی ہے اور دینی لحاظ سے سینکڑوں فرقوں میں تقسیم ہے۔ جس کے ذمہ دار دو ہی طبقات ہیں۔ سلاطین، ملوک، امرا اور حکام۔ اور علماء و فقہا و ملا و پیر۔ انھیں دونوں طبقوں نے ملت کو اپنا مطیع بنایا اور قرآن کو علماً اور عملاً متروک و مہجور کر دیا۔

اس لئے ملت کی اس وقت سب سے اہم ضرورت یہی ہے کہ وہ خلافت قائم کر کے پھر اپنا دینی اور دنیاوی مرکز ایک بنائے جس کی قیادت اور رہنمائی صرف قرآن مبین کی روشنی میں ہو سکے اور سارے دنیاوی اختلافات اور دینی تفرقے مٹ جائیں۔

امت کو ایک مرکز پر لانے کا احساس اکثر اسلامی ممالک کے مفکروں میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ مصر میں انجمن اخوان المسلمین اور پاکستان میں رابطۃ العالم الاسلامی وغیرہ اسی مقصد کا پتا دیتی ہیں۔ لیکن ان کا طریقِ کار غلط ہے۔ اس کے لئے قرآن کا سکھایا بلکہ بنایا ہوا ایک ہی راستہ ہے اور وہ حج ہے۔ اس رکن کو اللہ نے رکھا ہی اس لئے ہے کہ موحدوں کی امت میں جو مفاسد پیدا ہوں اس کے ذریعہ سے ان کی اصلاح ہوتی رہے۔ ایسی مقدس بین الاقوامی انجمن دنیا میں کسی قوم کے پاس نہیں ہے۔

کعبہ توحید پرستوں کی پہلی مسجد ہے جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جو موحدوں کے پیشوا ہے

اعظم ہیں۔ انھوں نے بحکم الٰہی اُس وقت اس گھر کو بنایا جبکہ دنیا میں کہیں کوئی گھر خالص اللہ کی عبادت کے لئے نہ تھا۔ اللہ نے اس گھر کو برکت عطا کی اور سرچشمۂ ہدایت بنایا جیسا کہ قرآن میں ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔

پہلا (توحید کا) گھر جو انسانوں کے لئے بنایا گیا وہ ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور دنیا جہان کی ہدایت کے لئے ہے۔

جب یہ گھر تیار ہو گیا تو اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ حج کے لئے یہاں آیا کریں۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ لِّیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے۔ وہ تیرے پاس پاپیادہ اور لاغر سواریوں پر جو دور دراز سے آتی ہیں آئیں گے۔ تاکہ اپنے فائدوں کے لئے آن موجود ہوں۔

صرف دو مختصر لفظوں "لیشھدوا منافع لھم" میں حج کی غرض بیان کر دی۔ یعنی اپنے فائدوں کے لئے لوگ یہاں آئیں۔ یہ فائدے عام ہیں۔ دینی، دنیاوی، سیاسی، ملکی، علمی، عقلی، اور تجارتی وغیرہ ہر قسم کے فائدے اس میں داخل ہیں۔

اسی دن سے کعبہ موحدوں کا بین الاقوامی مرکز ہے۔ خاتم النبیینؐ کے عہد میں اس مرکزیت کو مستحکم کرنے کے لئے جملہ ملت اسلامیہ کا قبلۂ نماز بھی اسی کو بنایا۔

آج حضرت ابراہیمؑ کے اعلان کو کم و بیش چار ہزار سال ہو گئے ہیں۔ حج کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور ہر سال دنیا کے ہر گوشہ سے موحد دریاؤں کو عبور اور پہاڑوں اور ریابانوں کو قطع کرتے ہوئے اس مرکز میں تاریخ معین پر آکر جمع ہوتے ہیں اور فریضۂ حج بجا لاتے ہیں۔

اللہ نے قرآن میں نہ صرف اس مکان بلکہ اس زمان کو بھی مرکزی لحاظ سے احترام بخشا جس میں یہ اجتماع ہوتا ہے

جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّھْرَ الْحَرَامَ وَالْھَدْیَ وَالْقَلَآئِدَ۔

اللہ نے عزت والے گھر کعبہ کو لوگوں کے ... مدار قرار دیا۔ اور ماہ حرام کو بھی اور ہدیہ اور قربانی کے جانوروں کو بھی۔

اس آیت میں اللہ نے کعبہ کی مرکزیت کی تصریح فرمادی کہ وہ موحدوں کا بین الاقوامی مرکز ہے جس پر ان کی تمام مصلحتوں کا دارومدار ہے۔ اور جس زمانہ میں یہ اجتماع ہوتا ہے اس زمانہ ذی قعدہ۔ ذی الحجہ اور محرم تینوں مہینوں کو محترم قرار دیا جس میں ہر قسم کی جنگ و پیکار روک دی جائے گی تاکہ لوگ امن اور فارغ البالی کے ساتھ اس اجتماع میں شریک ہو سکیں۔ قربانی کے جانور اور ہدی جو اللہ کی طرف سے دولت مند بندوں پر ان زائرین حرم اور ضیوف الہٰی کے لئے فرض کئے گئے ہیں ان پر بھی کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ الغرض اس رکن کا مقصد یہ ہے کہ پوری ملت کا اجتماعی مرکز ایک رہے اور اس میں جو خرابیاں واقع ہوں ان کی یہاں سے اصلاح کی جائے اور اس کی فلاح و بہبود کی راہیں نکالی جائیں۔ اسی لئے قرآن نے مسجد الحرام کے بین الاقوامی ہونے کا اعلان کیا۔

سَوَآءَ ۨ الۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَ الۡبَادِ

اس میں باشندے اور غیر باشندے یکساں ہیں۔

جس کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قرآنی بصیرت رکھنے والی جماعت نے جس میں حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی شامل ہیں پورے شہر مکہ کو بین الاقوامی قرار دیا۔ اور وہاں کے کسی باشندہ کا یہ حق نہیں تسلیم کیا کہ وہ اپنے گھر میں قیام کرنے سے کسی باہر سے آنے والے حاجی کو روک سکے۔ بلکہ وہ مکہ کے گھروں میں کواڑ لگانا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اگر کتوں وغیرہ سے تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔

حج کا طریقہ یہ ہے کہ جس جس ملک سے لوگ حج کے لئے آئیں اسلامی اصول کے مطابق اپنا اپنا ایک ایک امیر حج مقرر کر لیں۔ یہ امراء مکہ میں پہنچکر باہم ملیں۔ تبادلہ خیالات کریں۔ تاکہ ہر ہر اسلامی ملک کی موجودہ حالت اور ضرورت سامنے آجائے۔ پھر انھیں امراء میں سے ایک منتخب دماغ عرفات کے میدان میں مجمع حج میں خطبہ دے جس میں ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ اور ایک سال کے لئے اجتماعی لائحہ عمل ہو۔

ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبروں کو ہدایت کے لئے نصب فرمایا ہے۔ ان کا رشتہ قلوب کے ساتھ ہے۔ کیونکہ ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں وہ دلوں تک نفوذ کرتی ہیں۔ وہ بمنزلہ برقی بیٹری کے ہیں جن سے دلوں کے قمقموں میں حرارت اور روشنی پہنچتی ہے۔ ان سب کا مخرج میدان عرفات کا منبر ہے جو افسوس ہے کہ مدتہائے دراز سے خاموش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے قلوب افسردہ، منتشر اور بے نور ہیں۔ تنظیم کی صورت صرف

نصب مرکزیت ہے اور کچھ نہیں۔ کیونکہ مرکز کی طرف ہر فرد متوجہ ہو جاتا ہے جس سے ساری قوم خود بخود منظم ہو جاتی ہے۔ جیسے شمع کہ اس کے روشن ہوتے ہی گھر کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہے۔

افراد یا جماعتوں یا دیہات یا مسجدوں سے جو لوگ قوم کو منظم کرنا چاہتے ہیں ان کو کبھی کامیابی نہ ہوگی کیونکہ یہ انتشار راستہ ہے۔

حج سے فارغ ہو کر حجاج دسویں ذی الحجہ کو منا میں آجاتے ہیں اور یہاں یہ ساری جماعت قرآن کے حکم کے مطابق تین یا کم سے کم دو دن ٹھہرتی ہے۔ اس جگہ مسلم اقوام کو جن کا دماغی تعارف ان کے امرار کے ذریعہ سے مکہ میں ہو چکا ہے باہم مل جل کر اور ایک دوسرے کی میزبانی اور مہمانی کر کے موانست اور الفت پیدا کرنی چاہیے تاکہ آپس میں اخوت کا رشتہ زیادہ مستحکم ہو جائے۔

یہیں ہر جماعت کے امیر کو اپنے ہمراہیوں کو عرفات کا خطبہ اور آئندہ سال کا لائحہ عمل جو وہاں سے ملا ہے اپنی اپنی زبانوں میں سمجھا دینا چاہیے تاکہ جو حاجی وہاں سے پلٹ کر اپنی بستی میں آئے وہ عرفات کے منبر کا پیغام اپنے ساتھ لائے۔ اس سے تمام عالم اسلامی میں ایک نئی روح ایک نئی بیداری اور عملی وحدت پیدا ہو جائے گی۔ ملت اگر چاہے تو حج کے موسم میں متحدہ کوشش سے مکہ کو یعنی حجاز کو اپنا بین الاقوامی جمہوری مرکز بنا سکتی ہے جس میں ہر ہر اسلامی سلطنت کا ایک ایک نمائندہ شریک ہو۔ اس جمہوریت کا فریضہ یہ ہوگا کہ وہ خالص قرآن کو لیکر تمام اسلامی حکومتوں میں ہم آہنگی اور حکومت الٰہی کی اطاعت پیدا کرے۔ اور یہی اسلامی خلافت ہوگی۔

عجیب بات یہ ہے کہ قرآن کی رو سے مکہ اسلام کا مرکز ہے اور ہر قسم کا مرکز ہے۔ لیکن آج تک بجز قبلہ نماز اور مجمع حج کے اور کسی قسم کی مرکزیت اس کے حصہ میں نہیں آئی۔ اور اسلامی حکومت کا تو کبھی یہ مرکز بنا ہی نہیں صرف حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے چند سال تک اس کو اپنی خلافت کا مرکز بنایا تھا لیکن وہ تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی ان سے چھن گئی۔ ممکن ہے کہ اب اللہ تعالیٰ اس مبارک اور سرچشمۂ ہدایت شہر کو موحدین کی ایسی مرکزیت عطا فرما دے جو قیامت تک رہے۔

فلسطین

اہلِ فلسطین خواہ وہ کسی نسل سے متعلق کیوں نہ رہے ہوں، آغازِ تاریخ سے ہی جنگوں سے دوچار رہے ہیں۔ انسانی تاریخ کوئی زیادہ طویل نہیں، بمشکل چھ سات ہزار سال کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ تاریخ کی روشنی وقت کے اندھیرے کو اور روشن کر سکے تو فلسطین جنگ و پیکار میں ہی الجھا دکھائی دے گا۔ جغرافیہ نے اس مختصر سے ملک کو، کہ جس کا رقبہ بمشکل پنجاب کے چار اور سندھ کے دو اضلاع کے برابر ہوگا، کچھ ایسا مقام بخشا ہے کہ یہ حقیر سا ملک کبھی امن و اطمینان سے نہ رہ سکا۔ نقشۂ عالم پر نگاہ ڈالنے سے یہ روش ہو جائے گا کہ ایسا ناگزیر تھا۔

بین الاقوامی جنگاہ

منضبط تاریخ کے آغاز سے ہی فلسطین معلوم دنیا کا مرکز تھا۔ اس کے مشرق میں ایشیا تھا، مغرب میں یورپ، شمال میں پھر یورپ اور ایشیا اور جنوب میں افریقہ۔ یہ ساری کی ساری معلوم دنیا تھی۔ امریکہ، آسٹریلیا اور شمالی ساحل کے علاوہ سارا افریقہ غیر مساحت شدہ اور غیر معلوم تھا۔ شمالی اور جنوبی امریکاؤں اور آسٹریلیا ایسے وسیع و عریض ارضی حصص کی موجودگی کا گماں تک بھی نہ تھا۔ نقشہ پر یورپ تھا، اور وہ بھی جنوبی اور مشرقی، شمالی افریقہ مشمولہ مصر، اور ایشیا۔ اس معلوم دنیا کے عین وسط میں ایک معمولی حصہ زمین، انگلستان کے علاقہ ویلز کے برابر، فلسطین۔ معلوم دنیا میں قومیں ابھرتی اور مٹتی رہیں۔ چین، ہند، اسیریا، بابل، مصر، فارس، یونان، روما! ان اقوام کے عروج و زوال کے لئے باہمی تصادم ناگزیر تھا۔ ان بین الاقوامی معرکوں کے طوفان اس حقیر سے زمینی ٹکڑہ کو بے دردی سے روند ڈالتے رہے۔ اس کے حسیات و مطالبات دھرے کے دھرے رہ جاتے اور اس کے باشندے کچل دیئے جاتے۔ فلسطین کے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا کہ وہ اس کا حلیف ہو یا

اس کا حریف۔ وہ کس کی مدد کرے اور کس سے استمداد۔ اس کا فیصلہ اور انتخاب کچھ بھی ہو، نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

امن کے زمانہ میں فلسطین بین الاقوامی تجارتی قافلوں کی گذرگاہ تھا اور جنگ کے زمانہ میں عساکر و جیوش کی آماجگاہ۔ فلسطین بری اور بحری شاہراہوں پر تھا۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ فلسطین کے ذریعہ باہمی تجارت کرتے تھے۔ امن کی حالت میں فلسطین فارغ البال رہتا اور جنگ کے دوران میں وہ تباہ ہو جاتا۔ اس کی قومی آزادی و خود مختاری ناقابل حصول ہی رہی۔ ایسے مواقع پر کہ متحارب فریق برابر قوت کے مالک ہوتے تھے فلسطین کسی ایک طرف ہو کر پانسہ پلٹ دیتا تھا۔ اس وقت اہل فلسطین کی حقیر امداد بھی متعلقہ فریق کا پلڑا بھاری کر دیتی۔ لیکن یہ خطرناک اہمیت تھی۔ وہ حریف یا حلیف بن کر آسان جنگاہ بن جاتا رہا۔

آلِ اسرائیل

حضرت یعقوبؑ کا لقب اسرائیل (مردِ خدا) تھا۔ آپ کی اولاد سے جو نسل آگے بڑھی اسے بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے جو تھے بیٹے کا نام یہودہ (Juda) تھا۔ یہودہ اور بن یامین کی نسل کا قبیلہ فلسطین کے علاقہ موسومہ Juda میں سلطنت کرتا تھا۔ اسی نسبت سے انھیں یہودی کہا جانے لگا اور باقی قبائل کو بنی اسرائیل۔ آہستہ آہستہ یہ تفریق بھی جاتی رہی چنانچہ اب بنی اسرائیل اور یہودی کا ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ کا وطن کنعان (فلسطین) تھا لیکن حضرت یوسفؑ نے اپنے والد بزرگوار اور تمام قبیلہ کو مصر بلا لیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کی وجہ سے ان کی مصر میں بڑی تعظیم و تکریم ہوئی۔ چار سو برس تک یہ مصر میں رہے، یہیں بڑھے، پھولے پھلے۔ جو قبیلہ چند نفوس پر مشتمل تھا اس عرصہ میں عظیم الشان قوم بن گیا۔ فرعون مصر ان کی بڑھتی ہوئی قوت و کثرت سے خائف ہوا کہ مبادا وہ اس کے دشمنوں سے مل کر کوئی سازش برپا کر دیں۔ اس لئے اس نے انھیں کچلنے کی ٹھان لی۔ چنانچہ یہ حکم دے دیا گیا کہ بنی اسرائیل کی کثرت کو روکنے کے لئے ان کے بیٹوں کو ہلاک کر دیا جائے اور بیٹیاں زندہ رہنے دی جائیں۔ حضرت موسیٰؑ کہ آلِ اسرائیل کے اولوالعزم پیغمبر ہیں، اس عالم میں دارالسلطنت میں پیدا ہوئے کہ بنی اسرائیل کے بچوں کی ہلاکت کا انسانیت کش حکم نافذ تھا۔ مشیت ایزدی نے آلِ اسرائیل کے اس فرزند کو نہ محض ہلاکت سے بچایا بلکہ شاہی محلات میں

اس کی پرورش کا سامان کر دیا۔ اور اس کے بعد طور کی وادیوں میں آزاد تربیت کا انتظام۔ وہاں سے لوٹ کر انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ملک چھوڑ دینے کی اجازت دی جائے۔ یہودیوں کی اپنی روایات (عہد نامہ عتیق) کے مطابق حضرت موسیٰؑ کے بعد جوشوا کی قیادت میں بنی اسرائیل نے فلسطین کو بزورِ شمشیر فتح کیا اور قدیمی باشندوں کو ملک بدر کر دیا یا ان کا خاتمہ کر دیا۔ جدید مورخین اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے کہ قدیمی باشندے بالکلیہ نیست و نابود ہو گئے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کبھی بھی مکمل طور پر فتح نہیں ہو سکے بلکہ مفتوحہ علاقہ میں آباد رہے اور بنی اسرائیل سے ازدواجی تعلقات قائم کر لئے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی کتاب . . . The Outline of History میں لکھا ہے:

> یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موعودہ سرزمین The Promised Land کبھی بھی مکمل طور پر عبرانیوں کے قبضہ میں رہی ہے۔ انجیل کی متفرق کتابوں میں باختلاف واقعات تاریخ کو دہرایا گیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ Philistines جنوب کی زرخیز زمین پر قابض رہے اور شمال میں کنعانی اور فونیشین اسرائیلیوں کے مقابل ڈٹے رہے۔

اسرائیلی شبانی اور زرعی عادت کے مالک تھے، مگر ان میں سپاہی بھی تھے۔ مفتوح (یا ہنوز غیر مفتوح) پر رحم کرنا ان کے نزدیک یہودہ کے خلاف گناہ سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے پیشرو مالکان زمین کو ختم نہ کر دینا ادائے فرض میں ناکامی کے مرادف سمجھتے تھے۔ یہودیوں کی موجودہ خصائل — شہروں میں بسنا، مالیات و تجارت میں مہارت وغیرہ — ان کے اسرائیلی اسلاف کی خصائل ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی سلک دم کی تفسیر ہے۔ بعد میں وہ کاشتکار اور زراعت پیشہ رہے نہ کہ مدنی معمار۔ حضرت سلیمانؑ کے تزک و احتشام کے باوجود عہد نامہ عتیق کی داستان، مکانات اور محلات کے بجائے، گیہوں، انگور، زیتون، بھیڑوں اور بیلوں کی داستان ہے۔ خدا کے لئے ان کے ہاں عزیز ترین نام 'شبان' (گڈریا) ہے۔

حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ آل اسرائیل کے جلیل القدر بادشاہ تھے اور پیغمبر بھی۔ حضرت داؤدؑ نے پہلی مرتبہ گیارہویں صدی قبل مسیح میں یروشلم کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور حضرت سلیمانؑ نے دسویں صدی میں بیت المقدس کے پہلے ہیکل کی تعمیر کرائی۔ یہ زمانہ بنی اسرائیل کے اوجِ کمال کا زمانہ تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے

زمانہ میں ان کی شوکت وثروت انتہائی عروج تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے بعد انحطاط کے آثار شروع ہو جاتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے بعد بارہ اسرائیلی قبائل میں سے دس نے فلسطین کے شمالی حصہ میں "سلطنت اسرائیل" کا قیام کیا۔ باقی دو یعنی جوڈہ اور بن یامین کے قبائل بدستور جنوب میں تخت داؤد کے وفادار رہے۔

تباہی کی داستان

یوں تو یہود کی تباہی کی داستان کی ہر کڑی عبرت انگیز ہے، لیکن ان پر دو مرتبہ ایسی ہلاکت آفریں بربادی کی لعنت طاری ہوئی جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے شاید اس سے قبل نہ دیکھی تھی۔ قرآن نے ان دو مواقع کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر بربادی ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی، بلاجرم سزا نہیں تھی۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَ لَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا (۱۷/۴)

اور (دیکھو) ہم نے کتاب (یعنی تورات) میں بنی اسرائیل کو اس فیصلہ کی خبر دیدی تھی کہ تم ضرور ملک میں دو مرتبہ خرابی پھیلاؤ گے اور بڑی ہی سخت درجہ کی سرکشی کرو گے۔

تورات میں بھی بنی اسرائیل کی ان دو بڑی تباہیوں کا ذکر خاص طور پر آیا ہے۔ ان میں سے پہلی تباہی بابل کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں ظہور میں آئی۔ کوئی ۷۲۱ ق م میں شمالی فلسطینی حکومت پر اشوریوں نے قبضہ کر لیا تھا اور باشندوں کو قید کر کے لے گئے تھے۔ تاریخ ان کے انجام کے معمہ کے متعلق بالکل خاموش ہے۔ اس حادثہ کے کوئی دو صدی بعد بابل کے شاہ بخت نصر نے "جنوبی حکومت" کو تہ وبالا کر دیا۔ یروشلم کی کہ یہودیوں کا دینی اور سیاسی مرکز تھا اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یہ قتل وغارت گری سلب ونہب کا ایسا جاں گداز مرقع تھا جو تاریخ عالم میں ضرب المثل بن چکا ہے۔ اس سے نہ صرف بنی اسرائیل کی سلطنت ہی تباہ ہوئی بلکہ ان کی قومیت کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی اور غلامی ومحکومی، ہلاکت وبربادی کی بڑی سے بڑی مصیبتیں جو کسی قوم پر آسکتی ہیں سب یکجا ہو گئیں۔ بخت نصر نے یروشلم کو لوٹا، جلایا، یہودیوں کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو قید کر کے اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ یہ سانحہ ایسا المناک اور دل سوز تھا کہ یہودیوں کے بابل

کی اسیری کے زمانہ میں ان کے انبیاء ان کی اس زبوں حالی پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ اسارت کا یہ زمانہ شاہ فارس کے ہاتھوں ختم ہوا، جبکہ ساٹھ سال کے بعد سائرس نے دریائے فرات اور بحر روم کا درمیانی علاقہ فتح کرلیا۔ تو یہودیوں کو فلسطین واپس جانے کی اجازت دیدی۔ شاہ یا شاہانِ فارس نے یروشلم کی دوبارہ آبادی اور ہیکل کی از سر نو تعمیر کی بھی اجازت دیدی۔ چنانچہ ۵۲۰ سے ۵۱۵ ق۔م کے دوران میں ہیکل پھر تعمیر ہوگیا اور مردہ یہودی قوم نے پھر زندگی حاصل کی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہودیوں کی پھر سے وہی حالت ہوگئی اور وہ اسی نہج زندگی کی طرف لوٹ آئے جس کی پاداش میں ان کی پہلی بربادی ظہور میں آئی تھی۔ فارس کے زیر اقتدار یہودیوں نے جو تھوڑی بہت آزادی حاصل کی تھی سکندر نے ۳۳۲ ق۔م۔ اس پر ضرب کاری لگائی اور فلسطین کی آزادی کاملاً مسلوب کرلی۔ ۳۲۰ ق۔م میں بطلیموس Ptolemy نے مصر کے راستے حملہ کیا اور یروشلم پر قبضہ کرلیا۔ یونانیوں (مصری بطلیموسوں) نے یہودیوں پر خوب مظالم کئے۔ حتیٰ کہ سنہ ۶۳ ق م میں اس دوسری اور آخری تباہی کی تمہید شروع ہوگئی جن کا ذکر صحف یہود میں اور جن کے آثار ان کی پیشانیوں میں جھلک رہے تھے۔ پامپی (رومی) آگے بڑھا اور اس نے یروشلم پر قبضہ کرلیا۔ اس تاخت و تاراج میں قریباً بارہ ہزار یہودی تباہ ہوگئے۔ ۵۱ ق۔م کے قریب ایک اور یورش میں تیس ہزار یہودی غلام بنالئے گئے اور ڈھور ڈنگر کی طرح فروخت ہوئے۔

فطرت کی طرف سے انھیں باز آفرینی کا ایک اور موقع دیا گیا اور ان میں حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے لیکن یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ایک دنیا پر روشن ہے۔ اس اتمام حجت کے بعد ان کی آخری بربادی کا وقت آگیا۔ رومیوں نے سنہ ۷۰ء میں ایک ایسا وار کیا جس نے اس بدبخت قوم پر ابدی ہلاکت کی مہر ثبت کردی۔ اس کے بعد آج تک یہ قوم دشت نوائیوں اور صحرانوردیوں میں ذلیل و خوار ہے۔ "قبل مسیح" "بعد مسیح" میں بدل گیا لیکن یہودیوں کے مصائب میں کمی نہ ہوئی۔ سنہ ۱۳۵ء میں شاہ ہیڈرین Hadrian نے یروشلم پر قبضہ کیا اور اسے مکمل طور پر غارت کردیا اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال کر چار دانگ عالم میں بکھیر دیا۔

آئندہ سال یروشلم میں

فلسطین سے نکل کر یہودی جس جس ملک میں گئے وہیں آباد ہوگئے اور وہاں کے باشندے بن گئے۔ فلسطین میں ان کی تعداد بمنزلہ صفر کے رہی۔ ان میں سے بعض البتہ فلسطین کے خواب ضرور دیکھتے رہے اور وقتاً فوقتاً قطرہ قطرہ، فرداً فرداً فلسطین میں واپس آتے گئے۔

ان کی مراجعت کی ایک حد تک وجہ 'یادِ وطن' تھی اور ایک حد تک یہ مذہبی آرزو اور عقیدہ کہ فلسطین خدائے یہوہ Jehovah نے ان کے لئے مقدر کر دیا ہے۔ 'دشمن' کی فتوحات اور 'اپنی' شکستیں 'تقدیر' کے اس لکھے کو مٹا نہیں سکتیں۔ یہ آرزوئے 'وطن' مذہبی عقیدہ سے مذہبی رسم میں بدل گئی۔ چنانچہ ہر سال Passover کی ضیافت میں یہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں کہ "آئندہ سال یروشلم میں"۔

یہودی تاریخ ساز نہیں بلکہ تاریخ کی ساخت ہیں۔ انھوں نے تاریخ کو بنایا نہیں بلکہ تاریخ سے بنے ہیں۔ جب صحراؤں کی خاک چھاننے کے بعد ارض مقدس و موعودہ میں داخل ہوئے ہیں تو تاریخ کے قابل ذکر ابواب ان کی آس پاس کی قوموں کے ہاتھوں لکھے جا چکے تھے۔ انھوں نے نہ کلچر کو ترقی دی نہ تہذیب و تمدن میں ہی کچھ خاص اضافہ کیا۔ ان کی حکومت اور بقائے تشخص قومی کا دور مختصر اور ناقابل رشک تھا۔ جب بھی ان کے پاس کچھ دولت جمع ہو جاتی اور فراغت کے آثار نمایاں ہونے لگتے کوئی نہ کوئی غارت گر آ پہنچتا اور ان کو تباہ و برباد کر کے چلا جاتا۔ بخت نصر کے ہاتھوں جب ان کی تباہی ہوئی ہے تو پھر تاریخ کا رہا سہا رشتہ بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ شاہ فارس سائرس نے ہر چند انھیں فلسطین واپس آنے کی اجازت دیدی، لیکن چونکہ اسارت کا زمانہ ساٹھ سال کا ہو چکا تھا اس لئے کم تعداد میں یہودی واپس آئے اور جو آئے وہی اصلی یہودی نہیں تھے۔ ان کا تشخص مٹ چکا تھا اور ذلت و مسکنت کی دائمی لعنت ان پر مسلط ہو چکی تھی۔

زمان و مکان کے پاس یہودیوں کے لئے ظلم و استبداد کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں وہ دیگر اقوام کا تختہ مشق بنے رہے۔ جب عیسائیت کا دور دورہ شروع ہوا تو اس حقیقت کے باوصف کہ حضرت مسیح یہودی تھے اور ان کے اولیں حواری بھی یہودی تھے، ان کو دشمنان مسیحیت سمجھ کر مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔ یہ عجیب و غریب حقیقت ہے کہ عیسائیت یہی یاد رکھ سکی کہ مسیح کو مصلوب کرنے کے ذمہ دار یہودی تھے۔ وہ یہودہ اسکریوطی Judas Iscariot کو تو یاد رکھ سکی لیکن خود اپنے بانی حضرت مسیح، جان اور مال کو بھول گئی۔ عیسائی سلطنت میں یہودیوں کے لئے چنگڑ خانے بنائے گئے۔ معاش کی راہیں ان کے لئے مسدود کر دی گئیں اور ان کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ ان کے لئے سود خواری کے علاوہ کوئی راہ معاش نہیں تھی۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ انھیں طرح طرح کی جسمانی

اذیتیں پہنچائی گئیں اور بے دردی اور سفاکی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ پوپ پیس پنجم کے ایک حکم سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں پرانے کپڑے بیچنے کی اجازت بھی دیدی گئی۔ یہ قوی سزا اس ایک جرم کی پاداش میں تھی کہ وہ یہودی تھے۔

انقلاب فرانس نے عوام کا نظری مرتبہ بلند کیا اور خیالات و نظریات میں جو رواداری اور کشادہ نگہی پیدا کی وہ یہودیوں کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ ۱۷۸۹ء یہودیان یورپ کے لئے ایک نئی صبح کا پیغام تھا۔ آئندہ سو سال میں روس کے علاوہ ہر جگہ ان پر سے پابندی ہٹادی گئیں۔ اب وہ معزز شہری بن سکتے تھے، گاڑیوں میں سفر کر سکتے تھے، زمین کے مالک بن سکتے تھے اور دیگر آزاد شہریوں کی طرح آزادانہ کام کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں ان کے خلاف کسی قسم کی نفرت نہ پائی جاتی ہو۔ کم یا زیادہ، نفرت پائی ضرور جاتی ہے۔ ان مراعات کا خاطر خواہ اثر ہوا اور یہودی جہاں کہیں آباد تھے وہیں کے مستقل باشندے بن گئے۔ وہ کوئی دو ہزار سال سے غریب الدیار اور بے وطن مارے مارے پھر رہے تھے۔ فلسطین جس میں شاید ہی کبھی وہ اطمینان سے رہ سکے ہوں، ان سے چھن چکا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں میں بدستور مقدس تھا اور اس احساس تقدس کا مظہر وہ (Passover) کی سالانہ ضیافت تھی جہاں "آئندہ سال یروشلم میں" کا لفظی ورد کیا جاتا تھا۔ اس رسم میں اس امید کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ یہودی کسی نہ کسی دن، کسی نہ کسی طرح ہیکل سلیمان Temple of Solomon کی از سر نو تعمیر کریں گے۔ یہودیوں کی یہ مقدس آرزو مستقل خطرہ ہے۔ ہیکل سلیمان کی بجائے مسجد عمر استوار ہے۔ ایک کی تعمیر دوسری کی تخریب ہے۔ عرب (مسلمان) کہ سلیمان کو بھی اپنا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں، سلیمان کے ہیکل کو اپنی مسجد سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہیکل کی مسجد میں 'تبدیلی' نہ تخریب ہے نہ نئی تعمیر۔ بلکہ ان کے نزدیک یہ سلک مسلسل ہے۔ یہودیوں کے نزدیک تعمیر مسجد غصب ہے۔ وہ اسے برباد کر کے ہیکل کی تعمیر کے متمنی ہیں۔ یہ بنیادی فرق علت ہے اس تراع خونیں کی جس کی زد میں فلسطین ہے۔

مسلمانوں کی آمد

حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کے عہد میں یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کوئی چار ہی سال بعد ۶۳۶ء میں مسلمانوں نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ اس

وقت سے لے کر ۱۹۱۷ء تک کہ جنرل ایلنبی نے ترکوں سے اسے فتح کیا۔ سوائے اس عرصہ کے کہ صلیبیوں نے لاطینی حکومت کا قیام کیا فلسطین پر ہمیشہ مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ دسویں صدی میں عربی قوت و شوکت ان کی قبائلی عصبیت لہٰذا خانہ جنگی کے ہاتھوں کمزور ہو چکی تھی۔ ان کے مقابلہ میں ترک ابھر رہے تھے۔ گیارہویں صدی میں سلجوقی ترک میسوپوٹیمیا پر حملہ آور ہوئے اور خلیفہ وقت کو اپنے قبضہ میں کر لیا، گو بظاہر اسے خلیفہ ہی رہنے دیا۔ انھوں نے ۱۰۷۱ء تک ایشیا سے بازنطینی حکومت کا مکمل استیصال کر دیا۔ سلجوقیوں نے ۱۰۷۵ء کے قریب یروشلم پر بھی قبضہ کر لیا اور تابوت مقدس تباہ کر دیا۔ اس غارت نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ پوپ نے مقدس صلیبی جنگ کی تبلیغ شروع کر دی تاکہ "کافر" ترکوں سے پورا انتقام لیا جائے۔ ایک ناکام کوشش کے بعد ۱۰۹۹ء میں پاپائیان یورپ نے یروشلم پر حملہ کیا اور ایک ماہ کے محاصرے کے بعد اسے فتح کر لیا۔ یروشلم کی گلیوں میں اس قدر کشت و خون ہوا کہ گھوڑوں کے ٹاپوں سے خون کے چھینٹے اڑ اڑ کر سواروں پر پڑتے تھے۔ ۱۱۰۰ء میں لاطینی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۱۱۶۹ء میں غازی صلاح الدین ایوبی نے مسلمانوں کے منتشر قویٰ کو مجتمع کیا اور عیسائیوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ ۱۱۸۷ء میں مسلمانوں کا یروشلم پر قبضہ ہو گیا۔ مسیحیوں نے شکست کھا کر تیسری صلیبی جنگ کی طرح ڈالی مگر ناکام رہے۔ چوتھی صلیبی جنگ برائے نام تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ایوبی کے بھرپور وار کے بعد صلیبی بالکل نہیں سنبھل سکے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں پھر کبھی نہ آ سکے۔ اس کے بعد تاتاریوں کی ہلاکت سامانیوں کا سیلاب آیا اور گذر گیا۔ ان کے بعد ترکان عثمانی اٹھے جو یورپ میں بھی داخل ہو گئے۔ تھریس، بلغاریہ، مقدونیہ اور سرویا تک کو فتح کر لیا۔ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد خلافت کا اعلان کر دیا گیا جس کا الغا ۱۹۲۳ء میں مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں جنرل ایلنبی کے ہاتھوں فلسطین انگریزی قبضہ میں چلا گیا۔ تاریخ کے ان نشیب و فراز میں فلسطین اپنی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر فاتحین کی جنگ آزمائیوں کا میدان بنا رہا۔

صیہونیت جیسا کہ لکھا جا چکا ہے فلسطین سے نکل جانے کے بعد یہودیوں کی آبادی فلسطین میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ کچھ یہودی جو بیچارگی کے عالم میں پیچھے رہ گئے تھے وہ اسی حال میں رہ رہے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کہ یہ عرصہ مغربی قوائے استعمار کی خصوصی سرگرمی کا حامل ہے، بیرونی یہودیوں نے

فلسطین میں قدرے دلچسپی لینی شروع کی۔ استعماریت کے پس منظر میں فلسطین کی جغرافیائی اور سیاسی اہمیت کے پیش نظر یہ ناگزیر تھا۔ تمام قومیں اس اہم مرکز پر تسلط جمانا چاہتی تھیں۔ یہودیوں کی موجودگی سے عربوں کی اہمیت اور قبضہ کو کم کرنا مقصود تھا۔ چنانچہ کچھ یہودی خریدی ہوئی زمینوں پر آباد ہو گئے اور اس طرح "نئی آبادیوں" کی طرح ڈالی۔ لارڈ راس چائلڈ اور دیگر امیر ترین یہودیوں کی بدولت سرمایہ کی مطلقاً کمی نہیں تھی بلکہ مسرفانہ خرچ کیا جا سکتا تھا۔ متواتر پروپیگنڈے اور خیراتوں سے بیرونی یہودیوں کو جو اطمینان سے اپنے اپنے ملکوں میں رہ رہے تھے اور مطلقاً ترک وطن کے لئے تیار نہ تھے، ان کو رعب اور لالچ سے مجبور کیا گیا کہ وہ فلسطین جائیں، زمینیں خریدیں اور نئی یہودی آبادیاں بسائیں۔ لارڈ راس چائلڈ اور دیگر سرمایہ دار یہودیوں نے ان آبادیوں کے قیام و ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اس عالمگیر یہودی جدوجہد کا چنداں خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں فلسطین میں یہودیوں کا تناسب آبادی بمشکل پانچ فی صدی تھا جو پہلی عالمگیر جنگ کے آغاز تک سات فی صدی سے زیادہ نہ ہو سکا۔ اختتام جنگ پر ۱۹۱۹ء میں یہ تناسب دس فی صدی تھا۔ گویا سرمایہ کے بے تحاشہ استعمال کے باوجود فلسطین اختتام جنگ اول کے وقت مکمل عربی ملک تھا۔ کیونکہ عرب آبادی نوے فی صدی تھی۔

یہودی سرمائے اور پروپیگنڈے کو بین الاقوامی حالات نے کافی کمک پہنچائی۔ ۱۸۸۱ء میں روس اور رومانیہ میں آباد یہودیوں پر مظالم کا بے پناہ ریلا آیا۔ یہودی چار و ناچار ان ممالک سے نکل پڑے۔ ان تارکین وطن کی حقیر سی تعداد عازم فلسطین بھی ہوئی۔ ان دنوں یورپ میں ایک انجمن "محبان صیہون" Choveve Zion قائم ہوئی جس نے یہودی تارکین وطن کا رخ سوئے فلسطین پھیرنے میں خاصی سرگرمی دکھائی۔ ۱۸۹۷ء میں ایک آسٹروی صحافی Theodor Herzl نے صیہونی سوسائٹی Zionist Society قائم کی۔ ہرزل کا مقصد یہ تھا کہ یہودی قومی سٹیٹ میں اکٹھے ہو جائیں۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ ایسی سٹیٹ فلسطین میں ہو۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ ۱۹۰۳ء میں جب برطانوی حکومت نے اگینڈا Uganda کو بطور موزوں یہودی سلطنت (قومی وطن) کے پیش کیا تو ہرزل نے اسے قبول کر لیا۔ البتہ جب یہ پیشکش صیہونی کانگرس کے سامنے آئی تو اس نے نامنظور کر دیا۔ صیہونیت کا صدر مقام برلن تھا۔

یہودی استحقاق

فلسطین پر یہودی استحقاق بتایا جاتا ہے۔ اسی غرض سے ہم نے اوپر یہودی تاریخ کے اس حصہ کا سرسری جائزہ لیا ہے جو فلسطین سے متعلق ہے۔ اس مختصر سے تبصرہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہودی فلسطین پر ایک قلیل مدت کے لئے حکمراں رہے۔ اس زمانۂ اقتدار میں ہر چند انھوں نے مقامی باشندوں کا استیصال کرنے کی کوشش کی لیکن وہ انھیں صرف مغلوب کر سکے فلسطین سے ختم نہ کر سکے نہ اکھاڑ کر پھینک سکے۔ اس مختصر دورِ حکومت کے علاوہ ان کی ساری داستان ذلت و مسکنت اور تباہی اور بربادی کی داستان ہے۔ وہ ایک دفعہ فلسطین سے بے دخل ہوئے تو دو ہزار سال تک اس کی بازیافت کر سکنا تو درکنار اس میں معقول تعداد میں آباد بھی نہیں ہو سکے۔ ان کا فلسطین پر حق چند سالہ حکومت سے ہے یا اس جذباتی وابستگی سے جو وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں فلسطین سے ہے۔ تاریخ و سیاست اول الذکر حق کو مطلقاً تسلیم نہیں کرتی۔ تاریخ ایک بھی ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے کہ کوئی ملک کسی قوم کی تحویل میں محض اس لئے دے دیا گیا ہو کہ عہدِ ماضی میں وہ اس پر فرماں روا رہ چکی ہے۔ سیاست کا کوئی اصول اس دلیل بے معنی کو تسلیم نہیں کرتا۔ اگر یہ دلیل حق ملکیت کے حق میں دی جا سکتی ہے تو اس کا فائدہ عربوں کو ملنا چاہیئے نہ کہ یہودیوں کو۔ فلسطینی (عرب) ہمیشہ فلسطین کے مالک رہے ہیں۔ وہ اس پر حکمراں رہے ہوں یا کسی اور قوم کے محکوم، وہ فلسطین کے مالک رہے، اسی سرزمین سے اٹھے اور اسی خاک میں مدفون ہوئے۔ ان کا جسمانی تعلق فلسطین سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ یہودیوں کو فلسطین بخش دینے کا مطلب تو یہ ہے کہ اسے پہلے ان سے چھینا جائے جو اس کے جائز (بالغرض استدلال کہہ لیجئے ناجائز) مالک ہیں۔ لیکن عربوں کے حق میں تو یہی کافی ہے کہ وہ اس ملک میں رہے اور اس کے بدستور مالک ہیں۔ ان کے ہاں انتقالِ ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک یہودیوں کی فلسطین سے جذباتی وابستگی اور "آئندہ سال یروشلم میں" کی سالانہ رسم کا تعلق ہے اس کی حقیقت رسم کہن کے رسمی اعادہ سے زیادہ نہیں۔ اب تک جو یہودی فلسطین میں آکر آباد ہوئے ہیں وہ وہ ہیں جنھیں ان کے آبائی وطن سے نکال دیا گیا ہے، اور جنھیں صیہونی سوسائٹیوں نے مجبور کر کے فلسطین کی جانب بھیجا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ انگلستان اور امریکہ کے یہودی ترکِ وطن کر کے فلسطین میں نہیں آجاتے؟

کیا وہ ان یہودیوں کے مقابلہ میں جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور جنھوں نے فلسطین میں پناہ لی کم ایماندار یہودی ہیں؟ چونکہ ان یہودیوں پر ظلم و تعدی نہیں ہو رہا اس لئے "آئندہ سال یروشلم میں" ہی دہرانے کے باوجود اپنا ملک چھوڑ کر فلسطین جانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ خود راس چائلڈ اور دیگر سرمایہ دار یہودی فلسطین میں آکر آباد نہیں ہوئے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فلسطین یہودیوں کا قلبی مطالبہ نہیں بلکہ خصوصی اغراض و مصالح سے انہیں مظلومین پر ٹھونسا جا رہا ہے جو آبائی وطنوں سے نکالے جا رہے ہیں۔ اس طرح ان بدبختوں کے لئے اور مصیبت پیدا کی جا رہی ہے۔ یہودیوں کو یوں فلسطین پر ہونا جملہ کی ہمزادہ ہے۔

یہودی استحقاق کی دوسری وجہ مذہبی ہے۔ حضرات موسیٰؑ اور عیسیٰؑ فلسطین کے پیغمبر تھے اور یہودی اول الذکر کو اپنا قومی ہیرو تصور کرتے ہیں۔ یروشلم یہودیوں کا مذہبی مرکز ہے۔ یہ دلیل دیتے وقت اس بین حقیقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ خود عربوں کے لئے فلسطین اتنا ہی تقدس کا حامل ہے جتنا یہودیوں کے لئے۔ وہ پیغمبر جنھیں یہودی اپنا سمجھتے ہیں درحقیقت اسلام (لہذا مسلمانوں) کے پیغمبر ہیں۔ مسلمان ان پیغمبروں کا احترام ہی نہیں کرتے ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ فلسطین مسلمانوں کا قبلہ اول ہے۔ لہذا وہ عربوں کا ہی نہیں مسلمانان عالم کا مذہبی مرکز رہ چکا ہے۔ اس خاک کا ذرہ ذرہ مقدس ہے کہ وہ عروج و زوال اقوام کی الٰہی مشیت کے پروگرام کا آئینہ بردار ہے اور ایمان و عمل کی بے نظیر تجربہ گاہ۔ مسلمان کی تاریخ مذہب فلسطین کے بغیر نامکمل ہے۔ مسلمان جنھوں نے اس رشتہ عزیز کو ہمیشہ سینہ سے لگائے رکھا اور اسے جان سے عزیز تر رکھا اسے ہاتھ سے نہیں دے سکتا۔ یہودی اس رشتہ کو دو ہزار سال سے گم کر چکا ہے۔ وہ اسے ہاتھ میں لے سکتا ہے تو مسلمان کا سینہ چیر کر۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن مقامات پر مسلمان کا سینہ دونیم ہوا ہے وہ تاریخ کے فیصلہ کن مقامات تھے۔ آج ہم پھر ایسے ہی فیصلہ کن مقام پر ہیں!

عرب

یہودی تاریخ کے سرسری جائزہ سے ان کا دعوی باطل ہو جاتا ہے۔ لہذا عربوں کی تاریخ دہرانے کا یہ موقع نہیں۔ یوں بھی عربی تاریخ ایسا گمشدہ باب نہیں جسے کوشش سے نمایاں کیا جائے۔ البتہ ربط قائم کرنے کے لئے ہم مختصراً تازہ ابواب پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ ترکوں کے دور حکومت میں عالم عرب پر عمومی طور پر جمود چھا گیا۔ ان میں بیداری کے آثار ۱۸۴۲ء سے شروع ہوتے ہیں جبکہ وہابی تحریک

کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس تحریک کا آغاز عرب سے محمد ابن عبدالوہاب نے کیا۔ جس کا مقصد اسلام کو ان آلائشوں سے پاک کرنا تھا جو دمشق اور بغداد میں اس کا لازمہ بن چکی تھیں۔ چونکہ ترکی حکومت عربوں کے لئے سیاسی غلامی کا باعث بن گئی تھی اس لئے بتدریج ان میں آزادی خواہی کے جذبات بیدار ہوتے گئے۔ وہابی جیسی اصلاحی تحریک نے بیداری کے آثار پیدا کئے تو سیاسی غلامی نے ان کا رخ سیاست کی طرف ہی پھیر دیا۔ ۱۸۷۵ء میں پانچ نوجوانوں نے مل کر بیروت میں ایک خفیہ سیاسی انجمن کی طرح ڈالی۔ ایسی خفیہ انجمنوں کی سرگرمیاں آہستہ آہستہ ترکی کے خلاف بھی ہوتی گئیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں یورپی اقوام زندگی کی نئی تڑپ محسوس کر رہی تھیں۔ ان کے فکری ارتقا میں مادیت کو دخل تھا اور کئی ایک فلسفی وحشیانہ قوت کے علمبردار تھے۔ چنانچہ اقوام یورپ قومی تغلب کے نشہ میں بدمست ہو کر دنیا کے مختلف خطوں میں اپنے اپنے وقار کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں۔ ۱۸۶۰ء میں دمشق اور لبنان میں مسلم۔ عیسائی فسادات ہوئے جن میں عیسائیوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ ان فسادات کو بہانہ بنا کر نام نہاد عیسائی سلطنتوں نے مشرق ادنیٰ کے امور میں دخیل ہونا شروع کر دیا۔ یورپی قوی کی یہ مداخلت بتدریج بڑھتی گئی اور غیر یورپی ممالک ان کی باہمی رقابتوں کی آماجگاہ بن گئے۔ برطانیہ ہندوستان پر قابض تھا۔ وہ انگلستان سے ہندوستان تک کا راستہ محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ بحر روم اور بحر قلزم کے سواحل اس کے لئے مخصوص فوجی اہمیت رکھتے تھے۔ چنانچہ اس نے ۱۸۸۲ء میں مصر اور سوڈان پر قبضہ کر لیا۔ فرانس نے الجیریا (۱۸۳۰) اور ٹیونس (۱۸۸۱ء) پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی نے بھی مشرق وسطیٰ پر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اٹلی نے بحر روم کو رومی جھیل بنانے کے قصد سے لیبیا کی رگ جان میں اپنے خونی پنجے گاڑ دئے۔ یہ سلسلہ جنگ عالم گیر تک جاری رہا اور ممالک اسلامیہ استعمار فرنگ کا یا براہ راست شکار ہو گئے یا بالواسطہ اس کے زیر اثر آ گئے۔

اندرونی خرابیوں اور بدنظمیوں اور مغربی قوی کی ریشہ دوانیوں کے طفیل ترکی 'مرد بیمار' بن چکا تھا۔ ترکی اب تک خلافت اسلامیہ کا حامل تھا۔ اس کے دم سے بظاہر ممالک اسلامیہ ایک مرکز سے وابستہ تھے۔ یہ وابستگی جذباتی تھی لیکن سیاست نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ عربوں کو حاکم ترکوں کے خلاف حقیقی شکایات

تھیں۔ ترک اندرونی اور بیرونی مصائب میں مبتلا تھے۔ اس پر مستزاد استعمار کا سیلاب اور قوی مغرب کی باہمی رقابت تھی۔ آتش فشاں پہاڑ بالآخر پھوٹا اور ۱۹۱۴ء میں جنگ عمومی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ترکی جنگ میں جرمنی اور آسٹریا کا حلیف بنا۔ خلیفۃ المسلمین ہونے کی حیثیت سے سلطان ترکی نے جہاد کا اعلان کیا۔ اس اعلان کا اثر شام (کلاں) یا ممالک عربیہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں تک پر تھا۔ برطانیہ کے لئے یہ عظیم الشان خطرہ تھا جس کا سدباب اشد ضروری تھا۔ کچنر کی سیاسی پیش بینی کو اس خطرہ کا احساس جنگ سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ چنانچہ فروری ۱۹۱۴ء میں وہ حسین ابن علی، شریف مکہ سے اس کے دوسرے بیٹے عبداللہ کی معرفت مل چکا تھا۔

عرب اور برطانیہ

جیسا ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے ترکی حکومت استبدادی ہو چکی تھی۔ عرب اس کے ماتحت اپنے آپ کو غلام محسوس کر رہے تھے۔ اس احساس نے ان میں قومی شعور پیدا کرنا شروع کر دیا۔ عربوں میں عام طور پر ترکی کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ عرب خود متفرق اور غیر منظم تھے۔ عربوں میں وہ جذبہ پیدا ہو رہا تھا جو مذہبی نہ تھا بلکہ قومی بغاوت کا تھا۔ نتیجہ سیاسی آزادی اور وحدت عربیہ کا مطالبہ تھا۔ قومی شعور اندر اندر پیدا ہو رہا تھا لیکن کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ عرب ترکی کے اعلان جہاد پر لبیک نہیں کہیں گے یا وہ اس دعوت کے علی الرغم وحدت عربیہ کی دعوت کو ترجیح دیں گے۔ عرب صدیوں سے قبائلی عصبیت کا شکار چلے آئے ہیں۔ کیا اب اس سے بلند و بالا رہ سکیں گے؟ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکے تھے۔ ان کی سلطنت سیاسی قوت کے دم سے نہیں تھی بلکہ مذہبی جوش کی وجہ سے تھی۔

حسین، شریف مکہ، اپنی خلافت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ ترکی کے خلاف انگریز سے سازش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن عربوں پر اسے یہ اعتماد نہیں تھا کہ وہ وحدت عربیہ پر جمع ہو جائیں گے۔ اس کا دوسرا بیٹا عبداللہ پر امید تھا۔ وہ والد کی طرف سے کچنر، سارس اور بعد میں سر ہنری میکموہن سے مصروف گفتگو رہا۔ حسین کا تیسرا بیٹا فیصل ترکی کی معاونت کو ترجیح دیتا تھا تاکہ اس پر احسان کر کے معاہدہ امن میں کچھ حاصل کیا جائے۔ حسین نے عبداللہ سے اتفاق کیا۔ بقول لارنس حسین، فیصل سے متنفر بھی تھا۔ چنانچہ حسین نے انگریزوں سے مذاکرات جاری رکھے۔ اس کے ساتھ اس نے الفتاۃ، الاحد جیسی انقلابی جماعتوں سے بھی مراسم قائم کر لئے کیونکہ وہ

ترکوں کے خلاف کہیں زیادہ باغیانہ سرگرمی دکھارہی تھیں۔ جنگ جاری رہی۔ انگریز ترکوں اور جرمنوں کے ہاتھوں پیہم شکستیں اٹھاتے جارہے تھے۔ اب موقع تھا کہ عالم عرب کو ترکوں سے علیحدہ کیا جائے اور اپنے زیر اثر کیا جائے تاکہ انھیں ترکوں کے خلاف صف آرا کیا جاسکے۔ ایسے میں رسوائے عالم میکموہن مراسلت کا آغاز ہوا۔ میکموہن مصر میں برطانوی ہائی کمشنر تھا۔

حسین کا مطالبہ عرب آزادی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ عربی حکومت کی مغربی سرحد بحر قلزم اور بحر روم تک ہو۔ اس تحدید میں عرب، عراق، شرق اردن، فلسطین اور شام شامل تھے۔ میکموہن نے اسے تسلیم کرتے ہوئے ان اضلاع کو نکال دیا جو دمشق، حمص، حما اور ایلپو Aleppo کے مغرب میں واقع تھے۔ کیونکہ وہ علاقے خالصۃً عربی نہ تھے۔ اس مغرب کی بعد میں یہ توجیہ کی گئی کہ اس سے فلسطین عربی سلطنت کی حدود سے خارج ہو گیا تھا خود میکموہن نے ایک مرتبہ لندن ٹائمز میں لکھا کہ جن علاقوں سے متعلق وعدے کئے گئے تھے ان میں فلسطین شامل نہیں تھا۔ یہ قطعی غلط ہے اس لئے کہ میکموہن نے عربی سلطنت کی حد بحر روم تک تسلیم کر لی تھی۔ اس سے فلسطین خود بخود عربی حکومت میں آجاتا تھا۔ اگر بغرض استدلال اس شرط کو ساقط سمجھ لیا جائے تو نقشہ پر دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ فلسطین دمشق کے مغرب میں نہیں بلکہ جنوب مغرب میں ہے۔ ایسی دوراز کار اور احمقانہ توجیہیں برطانوی سیاست کا لازمہ ہیں۔ خود پاکستان کو ان کا کس قدر تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ فلسطین کو خارج کرنے کی ایک اور ایسی ہی لچر دلیل دی جاتی ہے۔ میکموہن نے ایک شرط یہ لگائی تھی کہ عربوں کے مطالبات تسلیم کرنے میں برطانیہ فرانس کے مفاد کے منافی اقدام نہیں کرے گا۔ فلسطین میں فرانس کا مفاد کچھ بھی نہیں تھا۔ لہٰذا یہ شرط فلسطین کے معاملہ میں ساقط العمل ہو جاتی ہے۔ یوں بھی فلسطین عربی ملک تھا اس کی عرب آبادی نوّے فی صدی تھی۔ اس کے اخراج کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ فلسطین کو نکال کر عربی حکومت اور وحدت عربیہ کا مطالبہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ ایک حلقہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چونکہ انگریز نے فلسطین کو فتح کیا تھا اس لئے اسے حق حاصل تھا کہ وہ اس کا کچھ بھی "استعمال" کرتا۔ قومیں جائدادیں نہیں ہوتیں کہ ان پر حق ملکیت تسلیم کیا جائے اور جیسے جی میں آئے ان کا استعمال کیا جائے۔ بیسویں صدی کی مہذب دنیا میں اس متروک و مردود نظریہ کو اساس گفتگو نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ یہ طرز استدلال غمازی کر رہا ہے کہ فرنگی ذہن سیاسی استبداد و ظلم سے ادپر

نہیں اٹھ سکا۔ ایسے حضرات نے ابی سینیا میں اٹلی کا حق ملکیت کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ انھوں نے چین کے مفتوحہ علاقے میں جاپان کا حق تسلیم کیا۔ اٹلی اور جاپان کے خلاف ان کی دی ہوئی دلیلیں خود ان کی تردید اور تغلیط کے لئے کافی ہیں۔

کرنل لارنس نے جنگ کے دوران میں عربی جذبات وطنیت کو ابھارنے میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ایلن بی نے اکتوبر ۱۹۱۷ء میں جب فلسطین میں جارحانہ کارروائی شروع کی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریز ایک حلیف ملک میں لڑ رہے ہیں اور ترک دشمن ملک میں ہیں۔ عرب سپاہی ترک فوجوں کو بھاگ بھاگ کر آ رہے تھے اور ترکی عساکر کا سلسلہ رسد و رسائل درہم برہم ہو رہا تھا۔ ایلن بی کے الفاظ میں عربوں کی امداد بے بہا تھی۔ لائڈ جارج نے موتمر امن (۱۹۱۹ء) میں اعتراف کیا۔

> شاہ فیصل نے اپنے تمام ذرائع ہمارے سپرد کر دیئے جس سے ہم کو مادی طور پر سب سے زیادہ مدد ان فتوحات میں ملی۔

جنگی امداد کے علاوہ عربوں نے انگریز کو کامیاب و فاتح بنانے میں کیا کیا۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگائیے:

> ان (عربوں) کے گھر کی ایک ایک چیز خوراک خریدنے میں صرف ہو گئی۔ حتیٰ کہ ان کے چھتوں کی ٹائلیں بھی بکنا شروع ہو گئی تھیں۔ . . . (یہ حالت جولائی ۱۹۱۷ء کی ہے) پندرہ ماہ بعد جب بیروت فتح ہوا ہے تو حالات اور بگڑ چکے تھے۔ یہ کہنا شک و شبہ سے مبرا ہے کہ جنگ کے دوران میں تین لاکھ شامی فاقوں مر گئے۔ صحیح شمار ساڑھے تین لاکھ کا ہے۔ کوئی تین ہزار جیلوں میں جھونک دیئے گئے جن میں سے بیشتر نذر اجل ہو گئے۔ شام کی چالیس لاکھ آبادی میں سے پانچ لاکھ کے لگ بھگ جنگ میں کام آئے۔ (The Arab Awakening)

عربی آزادی

عرب مسلمان تھے۔ انھوں نے ترکی کی دعوتِ جہاد کی کیوں پروا نہ کی؟ لارنس کے الفاظ میں:

> دوران جنگ میں عربوں کی ترکوں کے خلاف بغاوت اس لئے نہیں تھی کہ ترکوں کی حکومت خراب

تھی بلکہ اس لئے کہ عرب آزادی چاہتے تھے۔ انھوں نے جنگ کی آگ میں اپنی جانیں اس لئے نہیں جھونکی تھیں کہ وہ آقاؤں کی تبدیلی کریں اور برطانوی رعایا بن جائیں یا فرانسیسی شہری۔ بلکہ وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہتے تھے۔ (لارنس کے خطوط)

ترکوں کے استبدادی اور فاسد دور نے عربوں میں بہت حد تک جذبات قومیت و آزادی پیدا کر دیئے تھے۔ انگریز نے اس کا فائدہ اٹھایا اور عربوں کو آزاد عربستان کا سبز باغ دکھایا۔ عربوں کا اس دام میں آجانا عہد ماضی کا قدرتی نتیجہ تھا۔ ترکی اور جرمنی اتحاد کی شکست کی واحد صورت یہی تھی کہ مشرق وسطیٰ سے ان کو بے دخل کیا جاتا۔ اپنی اہمیت کے پیش نظر مشرق وسطیٰ جنگ کے نتیجہ کے لئے فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ انگریز نے یہیں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ انگریز کی وسیع سلطنت کے لئے مشرق وسطیٰ خصوصیت سے اہم تھا۔ چنانچہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنے کے لئے انگریز نے کمال فراخدلی سے ان سے وعدے کئے۔ چونکہ مقصد عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کرنا تھا اس لئے وعدوں کی معقولیت و عملیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس مصیبت میں انگریز نے ہر اس چیز کا وعدہ کیا جو وہ کر سکتا تھا اور جس کا نتیجہ عربوں کو ترکوں سے علیحدہ کرنا ہو سکتا تھا۔

عربوں کی شرکت جنگ وطنی آزادی کی خاطر تھی اور انگریز نے اس کا حتمی وعدہ کر رکھا تھا لیکن وہ اپنے قول میں کس قدر مخلص تھا اسکا اندازہ اس وقت کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ میکموہن نے اگست ۱۹۱۵ء میں حسین کو لکھا:

لارڈ کچنر نے جو اعلان علی آفندی کی معرفت آپ تک پہنچایا ہے۔ جس میں ہماری ممالک عربیہ اور ان کے باشندگان کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے، ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

خفیہ معاہدہ مئی ۱۹۱۶ء میں جبکہ عرب یقینی طور پر انگریزوں کے حلیف بن چکے تھے اس وقت برطانیہ اور فرانس میں ایک خفیہ معاہدہ Sykes-Picot Agreement طے ہوا۔ اس معاہدہ میں ہر چند برطانیہ (اور فرانس) کے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ وہ ایک آزاد عرب حکومت یا عربی وفاق کے موید ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے معاہد ممالک عربیہ کو حلقہ ہائے اثر (برطانوی اور

فرانسیسی، میں تقسیم کرنے پر اتفاق کر لیا۔ اس معاہدہ کی رو سے فلسطین کو بین الاقوامی علاقہ قرار دیا گیا۔ معاہدہ عربی ممالک سے متعلق ہو رہا ہے اور عربوں سے انگریز کے حتمی مواعید موجود ہیں لیکن اس کے علی الرغم فرانس سے یک طرفہ معاہدہ کر لیا جاتا ہے جو اس معاہدہ کی صریح خلاف ورزی ہے جو عربوں سے کیا جا چکا تھا۔ اگر سائیکس۔ پکٹ معاہدہ برطانیہ کے سابقہ مواعید کے مطابق تھا تو اسے حسین سے پوشیدہ کیوں رکھا گیا؟ کیا یہی بات شک کے لئے کافی نہیں تھی؟ استعمار فرنگ کی یہ بداخلاقی اور بددیانتی بین الاقوامی سیاست کا طرۂ امتیاز ہے اور بین الاقوامی مصائب کی کہ ان میں سے اہم تر فلسطین ہے علت العلل ہے۔ جب ۱۹۱۷ء میں روس کی اشتراکی حکومت نے اس خفیہ معاہدہ کو شائع کر دیا تو حسین نے فوراً میکموہن کو اس کے متعلق لکھا تو میکموہن نے اسے ترکی کی شر انگیز کوشش قرار دیتے ہوئے عربوں کی یوں تشفی کی کہ برطانیہ پہلے کی طرح عزم مصمم کئے ہوئے ہے کہ وہ وحدت و استقلال عربیہ کی تشکیل و تقویم کرے گا۔ انگریز کی اس منافقت کا انکشاف ہونے سے عربوں کے ایک حلقہ میں نہ صرف انگریز سے متعلق بلکہ خود حسین سے متعلق شکوک پیدا ہو گئے۔ چنانچہ سات عرب زعماء نے برطانیہ کو ایک یادداشت بھیجی جس کے جواب میں وزارت خارجہ (برطانیہ) نے The Declaration to Seven شائع کیا، اس اعلان میں پھر اعادہ کیا گیا:

> جن عربی ممالک پر اتحادی فوجوں نے قبضہ کیا ہے ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ان ممالک کی آئندہ حکومت متعلقہ باشندوں کی رضامندی سے تشکیل پذیر ہو۔ جو علاقے ابھی تک ترکوں کے قبضہ میں ہیں ان کے متعلق ملک معظم کی حکومت کی خواہش ہے کہ ان علاقوں کے غلام باشندے خود مختاری اور آزادی حاصل کریں۔ ملک معظم کی حکومت اس مقصد کی تکمیل میں بدستور کوشاں رہے گی۔

۷ نومبر ۱۹۱۷ء کو فلسطین، شام اور عراق کے کونے کونے میں ایک اعلان چسپاں کرایا گیا جس میں تحریر تھا:

> مشرق وسطیٰ میں جرمنی نے جس جنگ کی طرح ڈالی ہے اس میں شریک ہوتے ہوئے برطانیہ اور فرانس کے پیش نظر مقصد ان لوگوں کی مکمل اور حتمی آزادی Complete and final liberation ہے جو اب تک ترکوں کے غلام چلے آئے ہیں نیز ایسی

قومی حکومتوں کی تشکیل جو مقامی باشندوں کے آزادانہ انتخاب و فیصلہ کا نتیجہ ہوں گی۔ برطانیہ اور فرانس کسی قسم کا بھی نظام حکومت اپنی طرف سے مسلط نہیں کریں گے بلکہ وہ ایسی موثر امداد دیں گے جس سے وہ قومیں بخوبی چل سکیں۔

عربوں سے ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں، بیسیوں مرتبہ وعدے ہوئے کہ ایک عرب ریاست یا عربی ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے گا۔ لیکن موتمر امن اور اس کے مابعد عربوں کو تقسیم اور تقسیم در تقسیم کے سوا کچھ نہ ملا۔ سیریا کو شام، لبنان، فلسطین، عراق اور شرق اردن میں تقسیم کر دیا گیا۔ بقیہ شام کو آزادی نہیں دی گئی بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ انتداب قبول کرے۔ انتداب ایک 'بدعت' تھی جو جمعیت اقوام نے پیدا کی۔ نہ اس کا عربوں کی طرف سے مطالبہ ہو سکتا تھا نہ انگریزوں کی طرف سے وعدہ۔ وعدہ خالص آزادی کا تھا۔ جسے پہلو بدل بدل کر ٹالا گیا۔ عراق حسین کے بیٹے فیصل کو بخش دیا گیا۔ شرق اردن اس کے بیٹے عبداللہ کو۔ شام فرانس کے انتداب میں دے دیا گیا اور فلسطین برطانیہ کے انتداب میں کیا یہ فیصلے ان وعدوں کے مطابق تھے جو جنگ کے دوران میں عربوں سے کئے گئے تھے؟ کیا عربوں کا مطالبہ انتداب کا تھا؟ کیا یہ نئی حکومتیں مقامی باشندوں کی رضامندی سے مشکل ہوئی تھیں؟ عراق نے انتداب کی مخالفت کرتے ہوئے بامر مجبوری امریکی انتداب کو ترجیح دی، لیکن اسے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ یوں مقامی باشندوں کے ان مطالبات و حیات کو ٹھکرایا گیا جس کے احترام کے حتمی اور مکرر وعدے موجود تھے۔ لارنس لکھتا ہے۔

> فرانس نے دیوانہ وار انتداب بدلنے کی کوشش کی۔ برطانیہ نے شرمناک سودا کر کے اس (فرانس) کی تائید کی تاکہ وہ میسوپوٹیمیا حاصل کر سکے۔ س۔ پ۔ معاہدہ کی رو سے فرانس کو ساحل ملا اور عربوں کو ایلپو، حما، حمص، دمشق اور شرق اردن۔ انتداب کے صدقے میں اکثر و بیشتر حصے انگلستان اور فرانس نے ہتیا لئے۔ س۔ پ معاہدہ تحدید میں احمقانہ تھا مگر اس میں شام کا حق خود مختاری تسلیم کیا گیا تھا۔ یہ (معاہدہ) آئندہ فیصلے سے دس ہزار گنا بہتر تھا۔

اعلان بالفور برطانیہ کو چونکہ جنگ میں عربوں کی امداد کی ضرورت تھی اس لئے اس نے ان سے رنگا رنگ وعدے کئے۔ برطانیہ کو اسی طرح یہودیوں کی امداد کی بھی ضرورت تھی۔

چنانچہ اس نے عربوں کی طرح یہودیوں سے مبالغہ آمیز اور غیر دیانتدارانہ وعدے کئے۔ پہلی عالمگیر جنگ میں کہ جس کے سیاسی پس منظر کے ایک پہلو کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، جرمنی کی للچائی ہوئی نظریں مشرق وسطیٰ پر تھیں۔ وہ یہودیوں کی امداد حاصل کرنے کے لئے موہوم وعدے کر سکتا تھا۔ انگریز نے جرمنی کے وعدوں کو کھوکھلا کرنے کے لئے اس پر سبقت لے جانا چاہی۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی عربوں کی طرح سبز باغ دکھائے گئے۔ ان متضاد وعدوں کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں یہودیوں کا بے پناہ اثر تھا۔ وہ نہ محض امریکی پریس پر ہی چھائے ہوئے تھے بلکہ حکومت کی پالیسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ برطانیہ امریکہ کو اپنی طرف ضرور جنگ میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ کے بغیر جنگ کے لئے نہ مطلوبہ سرمایہ فراہم ہو سکتا تھا نہ مطلوبہ بارود اور اسلحہ۔ امریکہ کو شریک جنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہودی تھے۔ تیسری وجہ ڈاکٹر وائزمین، صدر زائنسٹ الیسوسی ایشن نے مہیا کی۔ کیمیا داں وائزمین نے کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں کوئی اہم انکشاف کیا۔ جسے اس نے برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ برطانیہ اس احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہتا تھا اور وائزمین نے ذاتی انعام سے انکار کر دیا تھا۔ اس سب الجھنوں کا حل اعلان بالفور ہے جو ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو شائع ہوا۔ اس میں مرقوم تھا:

> ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کو بنظر استحسان دیکھتی ہے اور امکانی کوشش کریگی کہ اس کا حصول آسان ہو جائے۔ یہ واضح رہے کہ ایسا کوئی اقدام نہیں کیا جائیگا جس کی زد فلسطین میں موجودہ غیر یہودی فرقوں کے شہری اور مذہبی حقوق پر پڑے یا یہودیوں کے اس سیاسی مرتبہ اور حقوق پر جو انھیں دیگر ممالک میں حاصل ہیں۔

اعلان بالفور ایک اہم سرکاری دستاویز ہے کہ جس کی رو سے یہودیوں اور عربوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس عجیب وغریب دستاویز میں کہیں عربوں کا ذکر نہیں۔ فلسطین کی آبادی میں اختتام جنگ پر نوے فی صدی عرب تھے اور صرف دس فی صدی یہودی۔ لیکن اس بدقسمت ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ذکر ہوتا ہے تو یہودیوں کا اور غیر یہودی فرقوں کا۔ گویا فلسطین میں بیشتر یہودی آباد تھے اور عرب اقلیت میں تھے، ایسی اقلیت کہ اسے 'غیر یہودی فرقہ' کی غیر واضح اور مبہم اصطلاح سے ہی یاد کیا جا سکتا تھا۔ اس سارے اعلان میں 'عرب' کا لفظ تک نہیں۔ اور مدبرین وسیاست داں عربوں کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے!

فلسطین کے اولین باشندے کون تھے؟ یہ کوئی یقینی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ یقینی ہے کہ عرب (مسلمان) تیرہ سو سال سے اس ملک پر قابض و متمکن چلے آرہے تھے۔ یہودی دو ہزار سال سے اس ملک سے بے دخل ہیں۔ اور اس دو ہزار سال میں ان کی زیادہ سے زیادہ آبادی دس فی صدی ہو سکی تھی۔ کیا دو ہزار سالہ تاریخ کا نوشتہ مٹایا جا سکتا ہے؟ کیا اتنے طویل سفر سے رجعت ممکن ہے؟ کیا انگریز یا کوئی طاقت تاریخ کے فیصلے کو الٹ سکتی ہے؟ کیا یہودیوں کو فلسطین اس لئے دیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی دو ہزار سال پیشتر اس میں آباد تھے؟ اس کے بعد وہ بھیڑ بکریوں کی طرح وہاں سے بکھیر دیئے گئے اور پھر کبھی اتنی قوت بھی مجتمع نہ کر سکے کہ اس مقدس ملک پر تسلط جما سکیں؟ کیا اب انگریزوں کو محض اس وجہ سے جرمنی کا ملک دیا جا سکتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کبھی جرمنی میں آباد تھے؟ یا انگلستان جرمنی کو بدیں وجہ بخشا جا سکتا ہے کہ اسے کبھی جرمن اسلاف نے فتح کیا تھا؟

یہودی وطن نہ کہ یہودی حکومت

بہرکیف اعلان بالفور نے 'قومی وطن' کا وعدہ کیا نہ کہ قومی حکومت کا۔ لیکن اس کے بعد کی ساری سیاست اسی نقطہ کے گرد گھوم رہی ہے کہ فلسطین یا اس کے کسی حصہ میں یہودی حکومت قائم ہو جائے۔ 'قومی وطن' ایک بالکل نئی اصطلاح تھی، لہٰذا دیانت کا تقاضا تھا کہ اس کے معانی متعین کر دیئے جاتے تاکہ فریقین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس سے پہلے کبھی بھی یہ مضحکہ انگیز تصور پیش نہیں ہوا تھا کہ کسی ایک قوم کو کسی اور قوم کے ملک میں قومی وطن دے دیا جائے۔ اس اصطلاح کو قصداً مبہم رکھا گیا تاکہ جانبین کو اس حسین مغالطہ میں رکھا جائے کہ ان کے حقوق محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس کے معانی یہودیوں نے کیا سمجھے؟ اس کا اندازہ وائزمین کے ایک اعلان سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا کہ اب فلسطین ایسی ہی یہودی اسٹیٹ بن جائے گی جیسی کہ انگلستان انگریزوں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالفور نے زبانی اس مجذوب کی بڑ کی تائید بھی کی تھی۔ لیکن کیا آئین و قانون میں زبانی وعدے حقیقت رکھتے ہیں؟ بالخصوص ایسے وعدے جنھیں ضبط تحریر میں لانے سے خاص طور پر گریز کیا جائے؟ وہ استغاثہ کی بنیاد نہیں بن سکتے نہ فیصلہ کی اساس ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسے زبانی وعدے کسی ملک پر اس کی منشا و رضامندی کے خلاف مسلط کئے جا سکتے ہیں؟

شاہ فیصل نے اعلان مذکورہ کو غیر مشروط تسلیم نہیں کیا بلکہ اس سے متعلق معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے تحریر کیا۔

بشرطیکہ عرب اپنی آزادی حاصل کرلیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اگر معمولی کمی بیشی بھی ہوگئی تو میں اس اعلان کے ایک لفظ کو بھی نہیں مانوں گا اور یہ اعلان ساقط العمل، بیکار اور ناجائز ہوجائیگا اور میں کسی طرح بھی کسی قسم کا جواب دہ نہیں رہوں گا۔

یہ غیر مبہم تحریر ہے اور اس کے صرف ایک ہی معنی ہوسکتے ہیں۔ اعلان بالفور عربوں کی آزادی میں منتج ہو تو قابل عمل ورنہ بے کار، ناجائز، ساقط العمل! اس اعلان نے یقیناً عربوں کو آزادی نہیں دلائی، بلکہ انھیں اور پابند سلاسل کردیا ـــــ لہٰذا عرب کا کوئی لفظ بھی ماننے پر مکلف نہیں ـــــ لہٰذا اعلان ساقط العمل! اب اسے اساس مذاکرات بنانا یعنی چہ!! اس کے بعد معاہدہ لوزان (۱۹۲۳ء) کی رو سے فلسطین کو برطانوی انتداب میں دے دیا گیا جس کی اساس اعلان بالفور پر استوار تھی۔

برطانوی وعدے

یہ ظاہر ہے کہ جنگ کے دوران میں ان کی امداد و تائید حاصل کرنے کے لئے برطانیہ نے عربوں سے بھی وعدے کئے اور یہودیوں سے بھی۔ یعنی پہلے عربوں سے پھر یہودیوں سے۔ یہ وعدے یا تو ایک دوسرے کی ضد ہیں یا باہمی طور پر مطابق۔ اگر متضاد ہیں تو اخلاقاً اور قانوناً وہ وعدے قابلِ قبول و عمل ہیں جو پہلے کئے گئے۔ کیونکہ ایک قانونی ضمانت دے دینے کے بعد انگریز اس سے متضاد وعدہ کسی اور فریق سے نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا برطانیہ کے وہ وعدے جو یہودیوں سے کئے گئے اور عربوں سے کئے گئے وعدوں کی ضد ہیں غیر قانونی اور قابل استرداد ہیں۔ اگر وہ وعدے ایک دوسرے کے مطابق ہیں تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عرب اپنی آزاد حکومت قائم کرسکتے ہیں اور انگریزوں کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ کسی عرب ملک میں کسی غیر عرب (یہودی) کی سلطنت قائم کریں یا اسے بزورِ شمشیر مسلط کریں۔ اس سے فیصلہ انتداب بھی غلط ہوجاتا ہے اور فیصلہ تقسیم بھی۔ اگر تینوں فریقوں یعنی برطانیہ، عربوں اور یہودیوں میں سے کوئی ان وعدوں کا مفہوم کچھ اور لیتا ہے تو اس کے حل کی بہترین صورت یہ ہے یا تھی کہ تحریری دستاویزات کو کہ وہی وجہ نزاع ہیں، بین الاقوامی عدالت میں برائے فیصلہ پیش کیا جاتا۔ برطانیہ

نے ایسا کرنے کی بجائے معاملہ جمعیۃ اقوام کے سپرد کیا جس نے عربوں کی مرضی کے خلاف برطانوی وعدوں کو ٹھکراتے ہوئے فلسطین (اور دیگر بعض عربی ممالک) کو انتداب کی لعنت میں گرفتار کر دیا۔ جمعیۃ اقوام ایسا کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ معاہدہ امن کی خبر پاکر عربوں نے جولائی ۱۹۱۹ء میں دمشق میں ایک موتمر طلب کی۔ اس موتمر کی قراردادوں میں ہے:

ہم جنوبی شام میں جس کو فلسطین کہا جاتا ہے، یہودیوں کے اس مطالبہ کو رد کرتے ہیں کہ وہاں یہودی دولت مشترکہ (Jewish Commonwealth.) قائم ہونی چاہیئے۔ ہم یہودیوں کے داخلہ فلسطین کے ہی مخالف ہیں۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان کا ایسا حق ہے اور ہم ان کے مطالبات کو اپنی قومی، سیاسی اور معاشی زندگی کے منافی سمجھتے ہیں۔ ہمارے (موجودہ) یہودی شہری ہماری طرح ملکی حقوق و فرائض میں بدستور شریک رہیں گے۔

ممالک عربیہ میں عام جذبات نفرت پھیل گئے۔ ان کا خون، ان کی قربانیاں سب اکارت گئی تھیں۔ عربی حمیت قومی خودداری کی یہ تذلیل کب دیکھ سکتی تھی؟ انھوں نے بچے ذبح کرائے، جوان قربان کئے، مصیبتیں جھیلیں، ملک برباد کرائے، اس امید پر کہ وہ آزادی سے ہم کنار ہو سکیں گے۔ لیکن اس سرفروشی اور ایثار پیشگی سے ملا تو کیا؟ غلامی! لعنت و ذلت!!

فیصل نے تنگ آکر ایک کمیشن کا مطالبہ کیا جو جملہ امور کی تحقیقات کرے۔ برطانیہ اور فرانس کو اپنی شیطنت کاریوں اور ریشہ دوانیوں کا علم تھا۔ انھوں نے اس منصفانہ مطالبے کو تسلیم نہیں کیا۔ البتہ امریکہ نے کہ اس وقت تک غیر جانبدار تھا اس کا خیر مقدم کیا۔ نتیجہ کنگ۔ کرین رپورٹ کی صورت میں نکلا۔ یہ رپورٹ اس لئے قابل ذکر ہے کہ غیر جانبدار اشخاص کی مرتب کردہ ہے۔ اس رپورٹ میں متشدد صیہونیوں کی مذمت کی گئی جو غیر محدود داخلہ فلسطین پر مصر ہیں۔ انھوں نے اس پر بھی زور دیا کہ قومی وطن قومی حکومت نہیں۔ ایسا کرنا "غیر یہودی فرقوں" کے مدنی اور مذہبی حقوق کو پامال کئے بغیر ناممکن ہے۔ واضعین رپورٹ نے تسلیم کیا کہ وہ ابتداً یہودیوں کے حامی تھے۔ اس کے باوجود حقائق و واقعات کا مطالعہ کر کے انھوں نے موتمر امن کو مشورہ دیا۔

یہودیوں کا داخلہ فلسطین یقینی طور پر محدود ہونا چاہیئے اور فلسطین کو یہودی دولت مشترکہ بنانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیئے۔

خلاف صیہونیت تحریک

۱۹۱۹ء کے بعد حالات کی رفتار بدل گئی۔ کیونکہ ہمہ گیر خلاف صیہونیت تحریک پھیل گئی جس سے یہودی کثیر تعداد میں سابقہ وطن ترک کر کے فلسطین میں آنا شروع ہو گئے۔ ان تارکینِ وطن یہودیوں کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا تو ان میں سے اکثر یقیناً فلسطین کا رخ نہ کرتے۔ فلسطین یہودی بے وطنی اور غربت کا حل نہیں۔ لیکن صیہونی سوسائٹیوں نے اس مصیبت کا فائدہ اٹھایا اور اس سیلاب کو فلسطین کی جانب پھیر دیا۔ ۱۹۳۲ء میں ہٹلر برسر اقتدار آیا تو اس کی نازی جماعت نے قرون وسطیٰ کے مظالم کی یاد تازہ کر دی۔ ہٹلر پہلی عالمگیر جنگ میں جرمنی کی شکست کا ذمہ دار بہت حد تک یہودی سازشوں کو قرار دیتا تھا۔ لہذا آئندہ تباہی سے پیشتر وہ اپنے ملک کو ان غداروں سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ ہٹلر کی فتوحات کے ساتھ ساتھ خلاف صیہونیت تحریک یورپ میں بھی پھیل گئی۔ یہودیوں کے پاس دو ہی صورتیں تھیں۔ جلاوطنی۔ قید خانے۔ جنگی خانے۔ خودکشی ـــــ یا فلسطین! چنانچہ ۱۹۳۹ء میں فلسطین کی یہودی آبادی ۳۰ فی صدی تک پہنچ گئی۔ ان کی تعداد پچپن ہزار سے ۱۹۴۵ء میں پانچ لاکھ اناسی ہزار ہو گئی۔ عرب قدرتی طور پر متوحش ہوئے۔ انھیں ڈر ہوا کہ اگر فلسطین کے دروازے بدستور کھلے رہے تو یہودی ایک دن اکثریت میں ہو جائیں گے اور ان کا ملک یہودی ملک ہو جائے گا۔ یہودیوں نے سرمایہ کے زور سے غریب عربوں کی زمینیں خریدنا شروع کر دی تھیں۔ وہ اپنی علیحدہ آبادیاں بنا اور بسا رہے تھے۔ ان کی آمد سے عرب بے دخل اور اقتصادی طور پر یہودیوں کے زیر اثر ہوتے جا رہے تھے۔ یہودیوں کی پشت پر وہ یہودی سرمایہ دار تھے جو افسانوی دولت کے مالک تھے۔ صیہونیت ایک منظم تحریک تھی۔ اس کے مقابلہ میں عرب غیر منظم اور مفلس تھے۔ لہذا ان کے خدشات قدرتی اور حقیقی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہودی مظلوم ہیں اور انھیں آبائی گھروں سے نکالا جا رہا ہے اس لئے انھیں اس ہمہ گیر خلاف صیہونیت تحریک کے چنگل سے بچایا جائے اور انھیں فلسطین میں آباد ہونے دیا جائے۔ یہ دلیل دینے والے فطرت انسانی کے ابتدائی محرکات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ عرب خود سامی النسل ہیں۔ لہذا یہ

ناممکن ہے کہ وہ بھی نام نہاد "اینٹی سامی" تحریک کے علمبردار بن جائیں۔ ہٹلر نے یہودیوں پر جو مظالم کئے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود آریائی نسل سے تھا اور سامیوں کا دشمن تھا۔ یہودی مظلومین کے نام نہاد ہمدرد اور بہی خواہوں نے جس انداز سے یہودیوں کو فلسطین پر ٹھونسا ہے اس سے "سامی دشمنی" کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ عرب کبھی 'سامیوں' (یہودیوں) کے دشمن نہیں تھے۔ وہ اب بھی نہیں۔ انھوں نے بارہا اعلان کیا ہے کہ عرب ممالک میں بسنے والے یہودیوں کو پورے شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ ان پر یہودی ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔ فلسطین میں موجود یہودیوں سے اب بھی وہ فراخدلانہ برادرانہ سلوک کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن جن یہودیوں نے عربوں کے وطن کو خون و آتش کی بازی گاہ بنایا ہے جن کے ہاتھوں عربوں کے مال و دولت کو نقصان پہنچا۔ ان کی جانیں ضائع ہوئیں۔ انھیں عرب کیسے برداشت کر سکتے ہیں۔ یہی نہیں کہ یہودیوں نے فلسطین کو نقصان پہنچایا بلکہ وہ اسے اپنی حکومت بنانے کے مذموم عزائم رکھتے ہیں۔ ہمدردان یہود نے یہودیوں کو 'سامی دشمنی' کے یورپی حلقے سے نکال کر عربی حلقہ میں جھونک دیا ہے۔ یورپ میں جو آگ خاموش ہو گئی تھی اسے مہمان اسرائیل نے عرب میں روشن کر لیا ہے۔ اب یہودی اپنے ہاتھوں جلائی ہوئی آگ میں جل رہے ہیں۔

انتدابِ فلسطین

انتداب فلسطین "اے کلاس" تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ فلسطین کی آزادی تسلیم کر لی گئی ہے لیکن جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا اسے نگرانی میں رکھا جائے گا۔ انگریز کی یہود نوازی عرب آزادی کی منزل کو دور سے دور تر کرتی جا رہی تھی۔ اس کی کیا ضمانت تھی کہ یہ سلسلہ اس وقت رکے گا جب فلسطین یہودی بن چکا ہوگا۔ ان کے ہوتے ہوئے کیا اعراب فلسطین آزاد ہو سکیں گے؟ ۱۹۲۷ء میں برطانیہ نے سیلف گورنمنٹ کی طرح ڈالنی چاہی۔ ایک نمائندہ اسمبلی کی تجویز ہوئی جو ہائی کمشنر کی مشاورتی مجلس ہوتی۔ یہودی ہر چند اقلیت میں تھے لیکن ان کے نمائندے برطانوی پارلیمان میں بھی تھے اور برطانوی حکومت میں بھی۔ یہ حقیر سی کوشش بھی یہودی مخالفت کی نذر ہو گئی۔ انگریز نے بانگ دہل اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا تھا لیکن اس نے اچانک اسے ترک کر دیا۔ عرب کب تک ضبط کرتے معاملات دگرگوں ہوتے جا رہے تھے صورت حال نازک تر۔ ۱۹۳۶ء میں فلسطین بھر میں احتجاجی مظاہرے شروع

ہوگئے۔ برطانیہ نے تشدد سے اس آزادی کی رو کو دبانا چاہا۔ عربوں کے ہیجان کی حقیقی وجوہات تھیں اس لئے حکومت کا جبر و تشدد اسے کچل نہیں سکتا تھا۔ برطانیہ نے پہلو بدلا اور رائل کمیشن کا قیام کر دیا۔ کمیشن کی تحقیقات کا ماحصل یہ تھا کہ انتداب ناقابلِ عمل ہے۔ کمیشن نے یہ اضطراری حل پیش کیا کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے اور برطانیہ، یہود اور عربوں کو علیحدہ علیحدہ حصے عطا کر دیئے جائیں۔

انتداب کا مقصد فلسطین کو آزادی کے لئے تیار کرنا تھا مگر برطانیہ نے فلسطین کو آزادی کے بجائے تقسیم کے لئے تیار کیا۔ یہ تقسیم کی پہلی تجویز تھی فلسطین کی تقسیم! پنجاب کے بمشکل چار اور سندھ کے کوئی دو اضلاع کے برابر ملک کی تقسیم!! اور تقسیم کیوں؟ اس لئے کہ یہود کے لئے عرب ملک میں قومی وطن قائم ہو سکے! ابتدا قومی وطن سے ہوگی اور انتہا قومی حکومت پر۔ آخر ان حرکات مذبوحی سے حاصل؟ فلسطین کی مجموعی آبادی بیس لاکھ ہے اور اس کا رقبہ دس ہزار مربع میل۔ کوئی پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ صحرائی غیر ذی زرع ہے۔ اگر یہ سارا علاقہ آبادی کے قابل ہو سکے تو فلسطین کی آبادی دوگنی یعنی چالیس لاکھ ــــ یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ ہو جائے گی۔ یہ قطعہ زمین یقیناً یہودیوں کے لئے ناکافی ہے۔ دنیا بھر میں یہودی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے۔ اتنا حجم غیر یقیناً اس مختصر سے قطعہ ارض پر نہیں سما سکتا۔ یعنی اگر سارے کا سارا فلسطین یوں یہودیوں کو دے دیا جائے کہ اس میں ایک عرب بھی باقی نہ رہے تو بھی یہودی اس میں نہیں سما سکتے۔ اور جب ایسا ہے کہ ان کی مشکل کا حل فلسطین نہیں ہو سکتا تو سارا زور صرف فلسطین پر صرف کرنے سے فائدہ؟ کیا یہودی ہمدردی کے بہانہ سے عربوں کو کچلا جا رہا ہے؟ اور پھر اگر بالفرض یہودی سما بھی جائیں تو برطانیہ اور امریکہ ایسا کرنے یا کرانے والے کون؟ انھیں کس آئین یا کس قانون نے یہ حق دیا ہے؟ اگر وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور بنی نوع انسان کے ہمدرد ہیں تو ان کا ادعائے ہمدردی انسان اس وقت کس غار میں جا چھپا تھا جب مشرقی پنجاب، دہلی، مغربی یوپی اور کشمیر کے بے کس اور نہتے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا۔ اس تاریخ میں نقید المثال قتل عام کی زد اتنے انسانوں پر پڑی جو مجموعی طور پر یہودیوں کی دنیا بھر کی آبادی سے بھی زیادہ ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے نہایت تحمل اور خاموشی سے یہ ہمہ گیر ہلاکت و بربادی کا تماشہ دیکھا۔ خود جمعیۃ اقوام متحدہ خاموش ہے۔ کم و بیش ساٹھ لاکھ مہاجرین فلاکت زدہ،

لئے لٹائے پاکستان پہنچے۔ کسی کو یہ قیامت دیکھ کر خیال نہ آیا کہ ان مہاجرین کو اپنے ہاں جگہ دے دیں یا دنیا کے کسی اور گوشہ میں ہی آباد کرا دیں۔ مسئلہ کی نوعیت دونوں حالتوں میں ایک ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مسئلہ زیادہ ہمہ گیر اور وسیع ہے۔

خیر، اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انگریز اور امریکہ بزورِ شمشیر یہودی سلطنت قائم کرا لیں گے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس حقیری سلطنت کی حیثیت کیا ہو گی؟ اس مفروضہ سلطنت کے مغرب میں بحر روم ہو گا، شمال، جنوب اور مشرق میں دشمن عرب۔ اتنے بڑے سمندر میں یہ معمولی سا جزیرہ کب تک محفوظ رہ سکیگا؟ اور بالفرض جنگ چھڑ جائے تو اس سلطنت کا کیا حشر ہو گا؟ یہودی سلطنت کا قیام محض عربوں کو ہی دشمن بنانے کے مرادف نہیں بلکہ دنیا بھر کے مسلمان، جو فلسطین سے ویسی ہی مذہبی عقیدت و وابستگی رکھتے ہیں جیسی کہ عربوں کی ہے۔ دشمن بن جائیں گے۔ مسلمانانِ عالم کی دشمنی کے مقابلہ میں ذرہ بھر سلطنت کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ یہ نہایت ہی خسارے کا سودا ہے۔ مسلمانانِ عالم کی دشمنی محض ایک کثیر گروہ کی دشمنی ہی نہیں بلکہ مسلمان ممالک جغرافیائی اور فوجی نقطۂ نگاہ سے نمایاں اہمیت کے مالک ہیں۔ مشرق وسطیٰ کو ہی لیجئے۔ اقوام مشرق وسطیٰ کا اتحاد بین الاقوامی جنگ میں موثر اور نتیجہ خیز ہو گا۔ مشرق وسطیٰ اور ممالک عربیہ کے تیل کے ذخیرے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ تیسری عالمگیر جنگ کے جو آثار ہویدا ہوتے جاتے ہیں ان سے آئندہ عسکری صف آرائی صاف طور پر دکھائی دے رہی ہے۔ روس اور اس کے دست نگر ایک طرف ہوں گے اور امریکہ اور برطانیہ اور ان کے معاون ایک طرف۔ دونوں جانبوں کو مشرقِ وسطیٰ کے اڈوں اور تیل کی اشد ضرورت ہے۔ دونوں مجبور ہوں گے کہ ان علاقوں اور ان کے باشندوں کو اپنے ساتھ ملائیں۔ دنیائے اسلام متحد و مرکوز ہو جائے تو وہ متصادم بین الاقوامی قوی میں توازن پیدا کر سکے گی۔ فلسطین کا مسئلہ اس نوعیت کا ہے کہ اس کے حل پر مسلمانانِ عالم کی دوستی اور دشمنی کا دار و مدار ہے۔ چنانچہ اگر برطانیہ فلسطین کے معاملہ میں مسلمانوں کی ہمدردی سے محروم ہو گیا تو دنیا میں کہیں بھی اس کے پاؤں جم نہیں سکیں گے۔ مشرق وسطیٰ بلکہ عالم اسلامی، اس کی جنگی مکافات اور اس کی طبیعی دولت کے مقابلہ میں ایک مختصر سی یہودی سلطنت ٹھکرائی جا سکتی ہے۔

جہادِ حریت

انگریز نے ان سب امور کو بالائے طاق رکھا اور یہودی محبت کے جنون میں اپنے مصالح و مفاد کو بھی بھول گیا۔ رائل کمیشن نے جب پہلی مرتبہ تقسیم کا حل پیش کیا تو برطانیہ کے عزائم کا عربوں کو اندازہ ہو گیا۔ جنگ کے دوران کے دلفریب الفاظ، جمعیۃ اقوام کے بلند بانگ کاغذی اصول، انتداب کا ادعائے آزادی سب منافقت پر مبنی تھے۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ فلسطین میں ہمہ گیر مظاہرے شروع ہو گئے۔ اب کے یہ مظاہرے ان علاقوں میں خصوصیت سے زیادہ تھے جن کے متعلق تجویز تھی کہ انھیں یہودی علاقہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک یعنی آغاز جنگ عالمگیر ثانی تک فلسطین جنگ سے دوچار رہا۔ ایک طرف مخلص اور مفلس عرب تھا جس نے اپنا سب کچھ انگریز کی خاطر قربان کیا، اس امید پر کہ وہ آزادی حاصل کر سکے گا۔ دوسری طرف انگریز تھا جس نے غلاموں کی آزادی خواہی کو عظیم الشان فریب دے کر انھیں مفت میں خرید لیا تھا۔ سابقہ دوست کا ہاتھ پرانے دوست سے حق دوستی کا تقاضا کر رہا تھا اور پرانا دوست سنگین، توپ، ہوائی جہاز سے اس کے جان و مال سے کھیل رہا تھا۔ اس جہادِ حریت کے قائد مفتی اعظم حسینی تھے۔

ڈاکٹر ماڈرائڈن نے اپنی کتاب The Problm of Palestine میں اس جہاد کا مختصر سا نقشہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> (انگریز کی طرف سے) تشدد کا جواب تشدد سے دیا جا رہا ہے۔ عرب دیہات پر حملے کئے جاتے ہیں اور حکومت کی فوج انھیں برباد کر دیتی ہے۔ تعزیری کارروائیاں جاری ہیں۔ ان میں ہوائی بمباری، گھروں کو بارود سے اڑا دینا، دیہات کی تباہی، مال و دولت کی بربادی، سب شامل ہیں۔ ملک میں حرکت محدود (اور دشوار) ہو گئی ہے اور کرفیو کا راج ہے۔ مشتبہ افراد کو قیدیوں کے کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور بغیر مقدمہ چلائے محبوس رکھا جاتا ہے۔ دوسروں کو جزائر سچل میں بغیر مقدمہ چلائے بھیج دیا جاتا ہے۔ کئی جیلوں میں سڑ رہے ہیں اور کئی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔

یہ لرزہ خیز داستان ہے، ان کے لئے ناقابل برداشت جو برطانیہ، اس کے مدبرین

اور اس کے سپاہیوں کے نام کو عزیز سمجھتے ہیں۔ میں اس پر اس سے زیادہ رائے زنی نہیں کرونگی کہ آئرلینڈ کے زمانہ Black اور Tans کے بدترین کوائف کو اس ملک میں دہرایا جارہا ہے جسے سب عیسائی یہودی اور مسلمان مقدس سمجھتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس فلسطین کو دیکھا ہے جس کا میں ذکر کررہی ہوں، ان کے لئے سرکاری تردیدی بیانات کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ انتہائی تشدد بے کار ثابت ہوا ہے اور اس سے منافرت اور بڑھی ہے۔ بارہا عرب مردوں اور عورتوں نے مجھ سے کہا ہے: اگر برطانوی فوج چوبیس گھنٹے کی چھٹی لے لے تو فلسطین میں ایک بھی یہودی زندہ نہ رہے۔ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو طبعاً نرم ہیں اور جو اسی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہودیوں کا مزید داخلہ بند کردیا جائے تو کل امن ہوسکتا ہے۔

عربوں کے جوش و شیفتگی کا یہ عالم تھا۔

ایک صاحب نے جن کا رنجیدہ فریضہ یہ تھا کہ وہ ان قیدیوں سے ملیں جنہیں تشدد کے جرم میں موت کی سزا ملی ہے، مجھ سے بیان کیا کہ انھوں نے ایک 'مجرم' کو دیکھا کہ وہ دوزانو ہو کر اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کررہا تھا کہ اس نے اسے ملک اور مذہب کی خاطر جان دینے کی عزت عطا کی۔ ایک عرب (عیسائی) عورت نے مجھے بتایا کہ ایسے بیٹے کی ماں سے جب اس نے اظہار تعزیت کیا تو اس ماں نے اس ہمدردی کو فخر و غرور سے رد کردیا۔ ایک ماں جس کا بیٹا اللہ نے یوں منتخب کیا ہو قابل رحم نہیں قابل عزت ہے۔ (ایضاً)

برطانیہ اپنی طاقت کے زعم میں اپنے جور و استبداد پر قائم رہا۔ بمبار ہوائی جہازوں کے سایہ میں ۱۹۳۸ء میں اس نے وڈہیڈ کمیشن ... Woodhead Commision بدیں مقصد فلسطین بھیجا کہ وہ تقسیم کے عملی پہلو سے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کی علت تشکیل تقسیم پر رائے زنی نہیں تھی بلکہ تقسیم کی جزئیات طے کرنا تھی۔ کمیشن کی رپورٹ معلومات سے پُر ہے۔ اس نے سابقہ تجربہ سے بس اختلاف کیا اور نئی تحدید پیش کی۔ رپورٹ کے ایک ایک صفحہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے، بہ خاموشی عیاں ہے کہ تقسیم ناقابل عمل ہے۔ چنانچہ کمیشن نے مجوزہ اجزائے فلسطین کی تحدید کے لئے فوجی

قوت کی ضرورت پر زور دیا۔ گویا کمیشن نے یہ تسلیم کر لیا اور حکومت برطانیہ کو بتا دیا کہ تقسیم کے لئے تلوار ناگزیر ہے۔ تلوار کہاں تک تقسیم کی جزئیات طے کر سکتی ہے؟ اس کا جواب کمیشن کے دس سال بعد تک کے واقعات نے بخوبی دیدیا ہے۔ جمعیتہ اقوام متحدہ بھی تقسیم نافذ کرنے سے عاجز آ چکی ہے۔

برطانیہ کی پالیسی میں تبدیلی

۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت نے عرب اور یہودی زعما کو مذاکرات کے لئے لندن بلایا۔ برطانیہ کا اعتماد عربوں کے دلوں سے اٹھ چکا تھا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۹ء تک کے پچیس سالوں کے انگریزی۔ عربی تعلقات افسوسناک داستان کے حامل ہیں۔ اتنی بدعہدیوں اور جور و تعدی کے بعد عرب انگلستان کے خلوص نیت کے کیسے قائل ہو سکتے تھے۔ انھوں نے پوری جرأت سے کام لیا اور استقامت سے اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ ان کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ یہاں سے لگ سکتا ہے کہ انھوں نے یہودیوں کے ساتھ ایک میز کے آس پاس بیٹھ کر مصروف گفتگو ہونے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ نے مجبوراً جانبین سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی لیکن کوئی مصالحت کی صورت نہ بن سکی۔ برطانیہ نے بالآخر ۱۹۳۹ء کا مشہور قرطاس ابیض شائع کیا جس میں ان کا اپنا حل پیش کیا گیا تھا۔

اس قرطاس کی رو سے یہودیوں کی آمد پر پانچ سال تک کے لئے پابندی ہٹا دی گئی۔ البتہ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار سالانہ کی رفتار سے آ سکیں گے۔ یعنی وہ کل پچھتر ہزار کی تعداد میں آئیں گے۔ پانچ سال کے بعد مزید آمد عربوں کی رضامندی پر منحصر ہوگی۔ ہائی کمشنر کو یہ بھی ہدایات دی گئیں کہ وہ ایسے قوانین بنائے جن سے یہودی عربوں کی مملوکہ زرعی زمین آسانی سے نہ خرید سکیں۔ بعض مخصوص علاقوں میں یہ خرید و فروخت حکومت فلسطین کی اجازت سے ہو سکے گی۔ دس سال کے بعد یعنی ۱۹۴۹ء میں فلسطین آزاد ہو جائے گا۔

قرطاس کا مطلب صاف ہے۔ یہودیوں کی تعداد میں مزید پچھتر ہزار کا اضافہ ہوگا۔ فلسطین دس سال کے بعد آزاد عرب حکومت بن جائے گا۔ یہودی اقلیت میں رہیں گے اور عرب حکومت کے شہری بن کر۔ قرطاس ابیض نے تقسیم کو دفن کر دیا اور عربوں کے مطالبات کی صداقت اور بے پناہی کے سامنے برطانیہ کی قوت و شوکت نے ایک حد تک سپر ڈال دی۔ عربوں اور یہودیوں نے اس فیصلہ کو تسلیم
اسی حال میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوگئی۔ برطانیہ نے اپنی طرف سے زمینوں کی خرید و فر

یہودیوں کے داخلہ سے متعلق پابندیوں پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمہ پر یورپی یہودیوں کی آمد کا دباؤ کافی بڑھ چکا تھا۔ صیہونیت فلسطین پر چھا جانے پر مصر تھی۔ قرطاس ابیض کی رو سے فلسطین کے دروازے بند ہو چکے تھے اور وہ عربوں کی رضامندی ہی سے کھل سکتے تھے۔ ادھر عرب جو پہلے بکھرے بکھرے تھے نہ محض فلسطین کے مسئلہ پر ہی بلکہ دیگر مشترک امور پر بھی متحد و متفق ہو گئے۔ یہ اتحاد و اتفاق ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو عرب لیگ کی باقاعدہ تشکیل میں ظاہر ہوا۔ عرب لیگ کی تشکیل کے بعد فلسطین کا معاملہ مقامی نہیں رہا بلکہ جملہ عالم عرب کا مشترک مسئلہ بن گیا۔ یہ مسئلہ یوں بھی فلسطین کے مقامی باشندوں کا کب تھا۔ فلسطین عربوں کا ہی نہیں مسلمانانِ عالم کا ہے اور تمام عالم اسلامی اس پر متفق ہے۔

انگلستان میں جنگ کے بعد حزب عمال برسر اقتدار آئی۔ ۱۹۴۵ء کے انتخاباتِ عامہ سے جو نئی پارلیمان مرتب ہوئی اس میں سولہ یہودی ارکان تھے۔ خود عمالی حکومت میں ایک وزیر اور دو نائب معتمد یہودی تھے۔ یہودیوں کو اپنے اس اثر و اقتدار کے باعث یقین تھا کہ وہ فلسطین کا فیصلہ حسب منشا کرا سکیں گے۔ لیکن جب وزیر خارجہ برطانیہ نے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چکانا چاہا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ قضیہ اتنا آسان نہیں جتنا یہودی شرکائے اقتدار بتا رہے ہیں۔ ایک طرف یہودی دباؤ تھا اور دوسری طرف ممالک عربیکی لیگ کی متفقہ مخالفت۔ بیون اسی فیصلہ پر پہنچا کہ یہ مسئلہ عربوں اور یہودیوں کی باہمی رضامندی سے ہی طے ہو سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ برطانیہ کوئی اقدام کرتا خبر مشہور ہو گئی کہ ٹرومین صدر امریکہ برطانیہ سے اپیل کرنا چاہتا ہے کہ کم از کم اور ایک لاکھ یہودی فلسطین میں فی الفور لے لئے جائیں۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک پچھتر ہزار یہودی تو جائز طریقے سے آ گئے تھے۔ لیکن ان کی ناجائز آمد کبھی مکمل طور پر بند نہیں ہوئی تھی۔ اس پر مستزاد ایک لاکھ اور تھے۔ جنہیں صدر امریکہ خواہی نخواہی فلسطین پر ٹھونسنا چاہتا تھا۔ بیون سے ٹرومین نے درخواست کی کہ وہ اس نازک مرحلہ پر ایسی درخواست کر کے مزید الجھاؤ نہ پیدا کرے۔ ٹرومین نے معذوری کا اظہار کیا اور اپیل کر دی۔ اس کی وجہ ۱۹۴۸ء میں ہونے والا صدارتی انتخاب تھا۔ امریکہ کے پریس اور حکومتی اداروں میں یہود کا بے پناہ اثر و رسوخ ہے۔ انتخابات کے موقع پر مخالف فریق یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی خوشامدیں کرتے ہیں۔ بقول شخصے اس موقع پر امریکہ پاگل ہو جاتا ہے۔ ٹرومین کو

ڈر تھا کہ اس نے یہ اپیل نہ کی تو اس کی حریف ری پبلکن پارٹی ایسا کر دے گی۔ اس صورت میں یہودی ووٹ ٹرومین کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ محض اپنی انتخابی جیت کے لئے امریکہ کی دونوں پارٹیاں فلسطین کو جہنم میں جھونک دینے پر تیار ہیں۔

ٹرومین کی اپیل کے جواب میں برطانیہ نے امریکہ کو دعوت دی کہ اگر وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرانا چاہتا ہے تو نتائج کی ذمہ داری لے اور یورپ میں یہودیوں کی حالت نیز فلسطین کی صورت حال کی پوری تحقیقات کرے۔ ٹرومین نے جھجکتے ہوئے یہ دعوت قبول کر لی۔ اس پر ایک مشترکہ انگلستانی۔ امریکی کمیشن مرتب ہوا۔ جسے ہدایت دی گئی کہ وہ چار مہینوں کے اندر اندر رپورٹ پیش کر دے۔ کمیشن کی متفقہ سفارشات ظاہر ہے کہ نہ عربوں کو مطمئن کر سکتی تھیں نہ یہودیوں کو۔ لیکن رپورٹ عربی مطالبات کی بے پناہی کا مزید اعتراف تھا۔ کمیشن نے ٹرومین کا مطالبہ من وعن تسلیم کر لیا کہ ایک لاکھ یہودی فوراً فلسطین میں داخل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ، امریکہ اور دیگر حکومتوں سے درخواست کی گئی کہ وہ بے وطن یہودیوں کے لئے یورپ میں کسی جگہ نئے گھر تلاش کریں اور اس ضمن میں فوری اقدام کریں۔ کمیشن نے نہ تو فلسطین کی آزادی کی سفارش کی، نہ عرب حکومت کی، نہ یہودی حکومت کی، بلکہ ایسی دو قومی حکومت کا مشورہ دیا جس میں عرب اور یہودی مساوی حقوق شہریت کے مالک ہوں۔ مزید رائے یہ تھی کہ فلسطین کو غیر معین عرصہ کے لئے انتداب سے نکال کر قومیت میں رکھ دینا چاہیے۔ زمینوں کی موجود پابندیوں کی تنسیخ کی رائے دیتے ہوئے کمیشن نے ایسی تجاویز پیش کیں جن سے عرب کسانوں وغیرہ کے اس ضمن میں حقوق کی نگہداشت مقصود تھی۔ آخری سفارش یہ تھی کہ جانبین کے تشدد کو سختی سے دبایا جائے۔

ایک دفعہ پھر "ثابت" کر دینے کے علاوہ کہ تقسیم فلسطین ناقابل عمل اور ناممکن ہے معاملہ آگے نہ بڑھایا جا سکا۔

فلسطین اقوام متحدہ میں

انتداب عملاً برطانیہ کے لئے ایک مہنگا سودا ہو گیا تھا۔ وہ دیانتداری سے فلسطین کو آزادی کے لئے تیار کرتا تو مسئلہ فلسطین پیدا ہی نہ ہوتا سیاسی اغراض نے ایسے پیچ پیدا کر دیئے کہ یہ مسئلہ لاینحل بن گیا۔ انتدابی عرصہ میں برطانیہ کو جان و مال کا

بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ انگریز اس لاحاصل زیان سے تنگ آچکا تھا۔ عرب اور یہودی بھی علی ہذا القیاس قدرتی طور پر اس صورت حال سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ عمال حکومت کو ان گتھیوں کو سلجھانا ضرور تھا، کیونکہ جنگ نے برطانیہ کے لئے ایسی گوناگوں مشکلات پیدا کردی تھیں کہ فلسطین ان کی کمر ہمت توڑ رہا تھا۔ ناچار برطانیہ نے "عطائے تو بہ لقائے تو" کے مصداق ۲ر اپریل ۱۹۴۷ء کو فلسطین کا معاملہ جمعیۃ اقوام متحدہ کے روبرو پیش کردیا۔

فلسطین اپنی مخصوص تاریخ کے اعتبار سے ایک قطعہ ارض نہیں رہا۔ جغرافیہ نے اسے کچھ ایسی اہمیت دی ہے کہ تاریخ ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہی۔ سطور بالا سے ظاہر ہوگا کہ فلسطین کانٹوں کی سیج پر ہی رہا۔ اسی اہمیت نے اسے پھر بین الاقوامی استخوان نزاع بنا دیا ہے۔ دوسری عالمگیر میں ہر چند برطانیہ، امریکہ اور روس متحد تھے لیکن ان کے باہمی اختلافات کبھی رفع نہ ہوسکے۔ جنگ کے یہ اتحادی اب دو فریقوں میں بٹ گئے ہیں۔ جنگ کا جو عظیم الشان بار برطانیہ پر پڑا ہے اس سے وہ اپنی پہلی عظمت اور استقامت بہت حد تک ضائع کرچکا ہے اور اب وہ امریکہ کا دست نگر ہے۔ امریکہ ایک امیر و متمول ملک ہے اور اسے جنگ نے کم سے کم نقصان پہنچایا ہے بلکہ اسے ناقابل شکست بین الاقوامی قوت دیدی ہے۔ امریکہ آئندہ جنگی مکنات کے خوف سے اس حیثیت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ روس، امریکہ اور برطانیہ کے مقابل میں تنہا ہے۔ وہ اپنے استحکام میں دیوانہ وار مصروف و منہمک ہے۔ مشرقی یورپ اور جنوبی یورپ کا بیشتر حصہ اس کا "حلیف" ہے۔ یونان اور اٹلی اس کی زد میں ابھی تک نہیں آسکے۔ ان حالات میں مشرق وسطیٰ کی اہمیت بڑھ گئی۔ جغرافیائی اہمیت پر مستزاد مشرق وسطیٰ کا تیل ہے۔ تیل آئندہ جنگ کی اشد ترین ضرورت ہے۔ ممالک عربیہ کا تیل اب تک ایک حد تک برطانیہ اور زیادہ حد تک امریکہ کے قبضہ میں رہا ہے۔ روس کے اپنے تیل کے ذخائر کافی ہیں لیکن وہ تیل کی دوڑ میں امریکہ سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ ایران میں اس کی مداخلت اسی ذہنیت کی آئینہ بردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی اور ممالک عربیہ میں اس کی "دلچسپی" بڑھتی جارہی ہے۔ امریکہ کی اپنی تیل کی پیداوار کافی ہے لیکن اس کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ ذخائر کے جلدی ختم ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ مشرق وسطیٰ کا تیل مقابلتاً نوانکشاف ہے۔ وہ کمیت اور کیفیت دونوں میں زیادہ ہے۔

چنانچہ اس تیل نے بین الاقوامی مسابقت پیدا کر دی ہے۔ تیل اور سیاست ایک ہوتے جاتے رہے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک اپنی پسماندگی کے طفیل چونکہ خود تیل کی پیداوار سے قاصر ہیں اس لئے یہ نعمت عظمیٰ ان کے لئے وبال جان بن گئی ہے۔ روس اور امریکہ کی انتہائی خواہش اور کوشش ہے کہ وہ ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھیں۔ فلسطین کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ کرکوک (عراق) سے تیل کی نالی (پائپ لائن) حیفہ (فلسطین) میں منتہی ہوتی ہے۔ حیفہ سے آگے تیل بذریعہ بحری جہاز لے جایا جاتا ہے۔ یہ لائن چھ سو بیس میل لمبی ہے۔ اس سے اس علاقہ کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ فلسطین کا انتداب اور دیگر متبادل تجاویز اسی سیاسی تسلط کی غمازی کر رہے ہیں جو استعماری قوی کے لئے ناگزیر سا ہو گیا ہے۔

اس پس منظر میں کیسے توقع ہو سکتی ہے کہ اقوام متحدہ فلسطین کے معاملہ کو حق و صداقت کے اصولوں کے مطابق طے کریں گی۔ اس پس منظر سے اقوام متحدہ کی متضاد اور احمقانہ حرکات قابل فہم ہو جاتی ہیں۔

بہرکیف فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش ہو گیا۔ اقوام متحدہ نے ایک خصوصی کمیٹی گیارہ ارکان پر مشتمل متعین کی جو فلسطین میں جا کر حالات و کوائف کا مطالعہ کرے اور اپنی سفارشات پیش کرے۔ کمیٹی مذکورہ نے ڈھائی ماہ کے بعد دو رپورٹیں پیش کیں۔ ایک اکثریت کی جس پر سات ارکان کے دستخط تھے اور دوسری اقلیت کی جس پر تین ارکان کے دستخط تھے۔ (ایک رکن غیر جانبدار رہا) اکثریت کی رپورٹ نے تقسیم کی تجویز پیش کی اور اقلیت نے ایسے وفاق کی جس کے اجزا عربی اور یہودی ریاستیں ہوں۔ عربوں نے ان میں سے کسی تجویز کو بھی قبول نہ کیا لیکن یہودیوں نے اکثریت کی رپورٹ کو منظور کر لیا۔ اقلیت کی رپورٹ کو یوں بھی اقوام متحدہ کے حلقوں میں کوئی اہمیت نہ دی گئی اور اقوام دو صفوں میں بٹ گئیں، ایک تقسیم کے حق میں اور دوسری تقسیم کے خلاف یعنی عربی وحدانی حکومت کے حق میں۔ اس پر فلسطین کمیٹی کی دو سب کمیٹیاں بنا دی گئیں جو متعلقہ تجاویز پر پوری طرح غور و خوض کریں اور اپنی سفارشات پیش کریں۔ کمیٹی ۱ ان ارکان پر مشتمل تھی جو تقسیم کے حامی تھے۔ دوسری سب کمیٹی وحدانی حکومت کے حامیوں پر مشتمل تھی (اس میں چھ عرب ریاستیں اور افغانستان اور پاکستان تھے) پہلی سب کمیٹی کی صدارت مندوب پولینڈ کے سپرد تھی اور دوسری کی مندوب پاکستان سر ظفر اللہ خاں کے سپرد۔

تقسیم کا فیصلہ

سب کمیٹی ۲ نے اپنی مدلل و معقول رپورٹ[1] میں اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ جمعیۃ اقوام متحدہ تقسیم فلسطین کی مجاز نہیں۔ یوں تو آنجہانی مجلس اقوام کو بھی یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب کر دے لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ مجلس تو عرصہ سے ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے حقوق و اختیارات کسی دوسری مجلس کے نام منتقل نہیں کئے تھے۔ اقوام متحدہ بالکل نیا ادارہ تھا۔ اسے فلسطین کے مستقبل سے متعلق کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا قانونی حق و اختیار نہیں تھا۔ چہ جائے کہ وہ تقسیم کا فیصلہ صادر کرتا اور پھر اسے خواہی نخواہی مسلط کرتا۔ اس کے علاوہ جب انتدابی حکومت نے اعلان کر دیا ہے کہ انتداب ختم کر دیا جائے گا تو فلسطین کو لامحالہ آزاد ہونا چاہیئے نہ کہ اقوام متحدہ میں تحویل میں آجانا چاہیئے۔ اقوام متحدہ کو اس ضمن میں برطانیہ کی تائید حاصل نہیں تھی۔ برطانیہ نے اپنی روش ایسی کر لی تھی کہ فلسطین اقوام متحدہ کے سپرد ہے۔ وہ جیسا چاہیں فیصلہ کریں۔ برطانیہ ان کے فیصلہ کا پابند ہو گا لیکن خود کسی قسم کی رائے یا مشورہ نہیں دے گا۔ وہ نہ تقسیم کے حق میں ہے نہ تقسیم کے خلاف۔ وہ اس فیصلہ کی تائید کرے گا جسے عرب اور یہود دونوں تسلیم کریں گے۔ برطانیہ نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو انتداب ختم کر دے گا اور فلسطین خالی کر دے گا۔ اختتام انتداب تک وہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرے گا اور امن و امان کا تنہا محافظ ہو گا۔ اس کی فوجیں یکم اگست تک فلسطین سے نکل آئیں گی۔ ۱۵ مئی کے بعد وہ فلسطین کے لئے ذمہ دار نہیں ہو گا۔

اس سب کمیٹی نے مشورا اقوام متحدہ کے پہلے ضابطہ کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی جس میں مذکور ہے کہ اقوام متحدہ کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ اقوام کو حق خود اختیاری میسر آئے اور وہ اپنی حکومت اپنی رضامندی سے طے کریں۔ اس کے مطابق فلسطین کا فیصلہ اہل فلسطین کے سپرد ہونا چاہیئے تھا نہ کہ اقوام متحدہ کے سپرد۔

---

[1] پولینڈ کے مندوب یعنی سب کمیٹی ۱ کے صدر نے سب کمیٹی ۲ کے صدر سر ظفر اللہ خاں کے سامنے اعتراف کیا: آپ کی رپورٹ ہماری رپورٹ سے بدرجہا بہتر ہے۔ بقول ظفر اللہ خاں اس سے اس کا مقصد سفارشات کی تائید نہیں تھا۔ بلکہ معلومات و انداز استدلال کی تعریف تھی۔

یہودی تارکین وطن کے داخلہ فلسطین سے متعلق کمیٹی مذکورہ نے بتایا کہ چونکہ فلسطین اب تک تین لاکھ یورپی یہودیوں کو پناہ دے چکا ہے اس لئے اس کے رقبے، ذرائع اور دیگر عناصر کے پیش نظر اس داخلہ کو بند کر دینا چاہئے اور یہودی مسئلہ کو بین الاقوامی خطوط پر طے کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مشورے دیئے گئے:

۱) جن یہودیوں کو اپنے گھروں سے زبردستی نکال دیا گیا ہے (اب چونکہ یورپ میں ان پر وہ ظلم وستم نہیں ہو رہا، اس لئے) ان میں سے جتنے بھی ممکن ہوں اپنے گھروں میں واپس کر دیئے جائیں۔

۲) جو آسانی اپنے گھروں میں واپس نہیں بھیجے جا سکتے ان کو ارکان اقوام متحدہ میں ان کی حکومتوں کی آبادی، رقبہ، ذرائع اور گنجائش کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

۳) ایک ایسی کمیٹی مرتب کی جائے جو ہر ملک میں یہودیوں کے بسانے کی تعداد وغیرہ مقرر کرے۔

فلسطین کی آئندہ حکومت وحدانی طرز کی تجویز کی گئی جس میں تمام اقلیتیں شریک ہوں اور ان کے لئے مناسب تحفظات ہوں۔

یہ سفارشات تبصرہ سے مستغنی ہیں اور مسئلہ زیر نظر کا صحیح حل ہیں۔ لیکن حل کی صحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اقوام متحدہ کے پیش نظر تو متضاد سیاسی مصالح تھے جن میں تطبیق محال تھی۔ لہٰذا حل ناممکن!

کمیٹی ۱۱ نے تقسیم کے حق میں سفارش کی۔ رسمی مراحل کے بعد معاملہ ۲۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو جنرل اسمبلی میں مباحثہ کے لئے پیش ہوا۔ تقسیم کا فیصلہ کیسے ہوا؟ یہ دلچسپ داستان ہے اور ہم مختصراً سر ظفر اللہ خاں کی زبانی پیش کرتے ہیں:

۲۷ نومبر امریکہ کا تہوار ہوتا ہے جسے یوم تشکر (Thanks giving) کہا جاتا ہے۔ اس لئے ہر رکن حتی کہ صدر تک کی خواہش تھی کہ نشست ۲۶ (بدھ) کی نیم شب تک ختم کر دی جائے۔ اسی اعتبار سے جانبین نے اس دن اپنی ساری قوتیں مرکوز کر لیں۔ تقسیم کے خلاف ۱۶ ووٹ جمع ہو گئے تھے۔ چونکہ ایسے معاملوں کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے تقسیم کے حق میں ۳۲ ووٹ درکار تھے۔ یہ قریباً ناممکن سا نظر آتا تھا۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ

ہم نے میدان مار لیا ہے اور تقسیم دفن ہو گئی ہے۔ اس اثنا میں افواہ مشہور ہو گئی کہ سیشن ملتوی ہو جائے گا اور ۲۸ تاریخ یعنی جمعہ کو منعقد ہو گا اور اسی دن ووٹ بھی لئے جائیں گے۔ صدر سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایسا ہی ہو گا۔ اسے بتایا گیا کہ دو دن کے وقفہ سے ہمارے ووٹ ضائع ہو جائیں گے لیکن کسی نامعلوم شخص نے التوا کے لئے کہا اور بالآخر سیشن ملتوی کر دیا گیا۔ یہ قابل ذکر ہے کہ گذشتہ سال یوم تشکر کو اسمبلی کا سیشن منعقد ہوا تھا لیکن اب یہ بہانہ کر دیا گیا کہ اس دن کو چونکہ امریکہ کی تعطیل ہوتی ہے اس لئے سیشن منعقد نہیں کیا جا سکتا۔

اس وقفہ میں نیویارک کے اخبارات میں خبر آئی کہ یہودی لیڈر ٹرومین سے ملے۔ انھوں نے یہ دھمکی دی کہ اگر تقسیم ناکام ہو گئی تو بحالی یورپ کا بل ناکام کر دیا جائے گا۔ امریکہ کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ٹیلیفونوں اور تار کے ذریعہ کئی تقسیم کے حامی مندوبین کی حکومتوں سے مصروف گفتگو ہوا اور انھیں اپنی ہدایات بدل دینے پر مجبور کیا۔ اس پر ہمارے ووٹ ۱۳ رہ گئے۔ ایسے مندوبین نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے اس مجبوری کا اظہار کیا کہ ان کی حکومتوں نے حکم دیدیا ہے کہ ووٹ تقسیم کے حق میں دیئے جائیں۔ مثلاً (Haiti) کے نمائندہ کی آنکھوں میں آنسو تھے جب اس نے کہا کہ ہم نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہم تقسیم کے خلاف ووٹ دیں گے لیکن ہمیں اس کے حق میں رائے دینے کی ہدایت آگئی ہے۔

مسٹر روزویلیٹ نے کہ آنجہانی صدر روزویلیٹ کے پوتے ہیں مڈل ایسٹ جرنل کی اشاعت جنوری ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ میں مسئلہ تقسیم کے فیصلہ کے وقت صیہونی دباؤ کا یوں ذکر کیا ہے:

ارکان اقوام متحدہ پر اثر ڈالنے کے لئے (تاکہ وہ جنرل اسمبلی میں تقسیم کے حق میں ووٹ دیں)... ٹیلیفونوں، تاروں، خطوں، ملاقاتوں اور سیاسی اور اقتصادی دباؤ کا طوفان امڈا چلا آرہا تھا۔ یہودیوں نے ان اقوام کو جو تقسیم کے خلاف رائے دینا چاہتی تھیں تقسیم کے حق میں رائے دینے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب کچھ اعادہ تھا اس کا جو کچھ نیویارک سٹیٹ کے انتخابات میں ہو چکا تھا۔

یہ کیفیت ہے اس دولت عظمیٰ کی جس کے سپرد دوسری عالمگیر جنگ نے اقوام عالم کی قیادت کر دی ہے اور

یہ ہے منظر اس ادارہ اقوام متحدہ کا جو اس لئے معرض تشکیل میں آیا کہ کرہ ارض سے جنگ کو بدر کر دیا جائے اور اقدار انسانیہ کو مستقل حیثیت دے کر امن و امان کو عام اور پائندہ کیا جائے۔ عراقی نمائندہ کے الفاظ میں صدر ٹرومین نے ہی فلسطین کو آگ لگائی ہے اور وہی اسے بجھا سکتا ہے۔ جنرل سر ایلن کنگھم، فلسطین کے آخری برطانوی ہائی کمشنر نے ۲۵ فروری ۱۹۴۸ء کو ایک بیان میں کہا کہ اگر بیرونی مداخلت نہ ہوتی تو برطانیہ خوش اسلوبی سے مسئلہ فلسطین کو حل کر لیتا۔ بین الاقوامی ریشہ دوانیاں سیاست دولِ عظمیٰ کا طغرائے امتیاز ہیں اور انہی نے فلسطین کو عقدہ لاینحل بنا رکھا ہے۔

ان حالات میں ۲۹ نومبر کو جنرل اسمبلی نے تقسیم کا فیصلہ صادر کر دیا۔ ۵۷ ووٹوں میں سے ۳۳ تقسیم کے حق میں تھے، ۱۳ مخالف، دس ارکان غیر حاضر رہے۔ رائے شماری کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ امریکہ باوجود ساری ریشہ دوانیوں کے دو تہائی ووٹ حاصل نہیں کر سکا۔ جو ارکان غیر حاضر تھے وہ تقسیم کے خلاف تھے۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ ۳۳ کے مقابلہ ۲۳ ووٹ تھے۔ یہ کثرت رائے تو ہے دو تہائی ووٹ نہیں۔ بہرکیف تقسیم کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ امریکہ نے یہودی ووٹوں کی خاطر بلا سوچے سمجھے اقوام متحدہ کو صحرا میں جھونک دیا۔ قبل اس کے کہ امریکہ کی مشکلات کا ذکر کیا جائے تقسیم کے مالہ وماعلیہ پر ایک طائرانہ نگاہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔

تقسیم کا خاکہ

اس فیصلہ کے مطابق فلسطین عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا۔ سارے ملک کو ایک مشترکہ اقتصادی بورڈ کے ماتحت کر دیا گیا جس کے ارکان میں سے تین یہودی ہوں گے، تین عرب اور تین اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے نمائندے۔ ہر چند یہ فیصلہ تقسیم کا تھا لیکن مشترکہ اقتصادی بورڈ رکھ کر ایک مرتبہ پھر عملی اعتراف کیا گیا کہ اس ملک کی تقسیم ناقابل عمل ہے۔

یہودی سلطنت تین حصوں پر مشتمل تھی۔ شمال میں مشرقی گیلی جس کی سرحدیں شام اور لبنان سے ملتی ہیں۔ وسط میں تل عفیف (Tel Aviv.) کی بندرگاہ اور ساحلی میدان، جنوب میں نجف Negev پہلی تجویز کے مطابق جافا کی بندرگاہ یہودی سلطنت میں شامل تھی۔ اس کے مطابق یہودی حصہ ملک میں پانچ لاکھ نو ہزار سات سو اسی (۵۰۹۷۸۰) عرب تھے اور چار لاکھ ننانوے ہزار بیس (۴۹۹۰۲۰) یہودی۔ گویا یہودی حصہ

میں عربوں کی اکثریت تھی۔ اس غیر معقول، غیر منصفانہ تقسیم کے لئے وجہ جواز یہ پیش کی گئی کہ یہودی بیرونی یہود کی آمد سے اپنی آبادی جلدی بڑھالیں گے اور پھر وہ اکثریت میں ہو جائیں گے۔ جافا نکال دینے کے بعد یہودی علاقہ میں چار لاکھ اٹھانوے ہزار (۴۹۸۰۰۰) یہودی اور چار لاکھ پینتیس ہزار (۴۳۵۰۰۰) عرب رہ گئے — فلسطین کی کل آبادی بیس لاکھ ہے جس میں سے تیرہ لاکھ عرب ہیں اور چھ لاکھ پچاس ہزار یہودی۔ تقسیم کے حامی یہ دلیل دیتے تھے کہ اس یہودی آبادی کو عربوں کے ماتحت اقلیت بنے رہنے پر مجبور کرنا ناانصافی اور ظلم ہے۔ لیکن یہ دلیل دینے والے عربوں کو بالکل نظر انداز کر رہے تھے۔ اگر یہودیوں کو اقلیت بنانا ظلم تھا تو عربوں کو اقلیت بنا دینا کہاں کا انصاف تھا؟ یہودی کل آبادی کا ۳۳ فی صدی تھے۔ اس کے برعکس یہودی علاقہ میں عرب ۴۶ فی صدی تھے، گویا ۳۳ فی صدی کو ۶۷ فیصدی کی حکومت کے تحت اقلیت رکھنا تو ظلم تھا لیکن ۴۶ فی صدی کو فی صدی کے تحت اقلیت بنا دینا ظلم نہیں تھا، عین انصاف تھا۔ مجموعی آبادی کو چھوڑ کر مختلف اجزا کی علیحدہ آبادی لی جائے تو معاملہ اور مضحکہ انگیز ہو جاتا ہے۔ گیلیلی میں چھیاسی ہزار عربوں کے مقابلہ میں اٹھائی ہزار یہودی ہیں۔ نجف کی ایک لاکھ دو ہزار کی آبادی میں صرف دو ہزار (پھر سنئے صرف دو ہزار) یہودی ہیں۔ وسطی علاقہ میں ساٹھ فی صدی یہودی اور ۴۰ فی صدی عرب۔ اگر فلسطین کے انتظامی حصوں کو علیحدہ علیحدہ لیا جائے تو یہودیوں کی حالت اور قابل رحم ہو جاتی ہے۔ فلسطین کے ۱۴ یا ۱۶ انتظامی حصوں میں سے صرف ایک یعنی حیفہ میں یہودیوں کی اکثریت ہے۔ باقی ہر جگہ وہ اقلیت میں ہیں۔ ان کی حکومت کہاں قائم ہو سکتی ہے؟ آبادی کے علاوہ زمین کی ملکیت میں بھی عرب بڑھے ہوئے تھے۔ یہودی علاقہ میں زمین کی نجی ملکیت میں عربوں کا ۶۰ فی صدی حصہ تھا اور یہودیوں کا ۴۰ فی صدی۔ اس کے علاوہ یہودیوں کو جو علاقے بخشے گئے وہ زرخیز میدان تھے جنہیں مزید ترقی دی جا سکتی تھی۔ لیکن عربوں کے حصہ میں پہاڑی علاقے آئے جو ناقابل ترقی تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ عربوں کو اقتصادی بورڈ کا محتاج بنا دیا جائے اور بتدریج ان کی ترقی مسدود کر دی جائے۔

امریکہ کی مشکلات

تجویز تقسیم کے بعد پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مرتب کیا گیا تاکہ وہ تقسیم کے نفاذ سے متعلق سفارشات پیش کرے۔ ڈھائی ماہ کے بعد

۱۶ر فروری ۱۹۴۸ء کی شب کو اس کمیشن نے رپورٹ شائع کی جس میں اعتراف کیا گیا ہے کہ صورت حال انتہائی نازک ہے اور اس کے مزید بگڑنے کا احتمال ہے۔ عربی قوی اندرون و بیرون فلسطین جنرل اسمبلی کے فیصلہ تقسیم کو بزورِ شمشیر بدلنے پر کمربستہ ہیں۔ یہودی بھی علی ہذا القیاس اپنے مطالبہ پر اڑے ہوئے ہیں۔ اختتام انتداب پر مکمل بدامنی پھیل جائے گی۔ کمیشن نے اس کے مقابلے کے لئے بین الاقوامی پولیس فورس کا مشورہ دیا۔ یہ مشورہ ایک لحاظ سے نیا نہیں تھا کیونکہ اس کا پہلے سے ہی احساس تھا۔ امریکہ اس زعم میں تھا کہ وہ محض رعب سے عربی حکومتوں کو خاموش کرا دے گا اور اس کے لئے قوت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ عرب روز بروز اپنے مطالبات میں متشدد ہوتے جا رہے تھے۔ فلسطین کی مجلس اعلیٰ نے فلسطین کمیشن کو بتایا کہ عرب یہودی ریاست کی تشکیل کی ہر کوشش کو اقدام جنگ سمجھیں گے۔ اور اس کا پورا مقابلہ کریں گے۔ عرب لیگ کے جنرل سکرٹری عزام پاشا نے ۷ر فروری کو اعلان کیا کہ اگر تقسیم کو قوت کے بل بوتے پر مسلط کیا گیا تو باقاعدہ عربی فوجیں تقسیم کا مقابلہ کریں گی۔ عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ امریکہ کے کمزور ترین نقطہ پر حملہ کیا۔ مارچ کے اوائل میں نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار متعینہ قاہرہ نے یہ خبر بھیجی کہ عرب لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ امریکی کمپنیوں کو اجازت نہیں دیگی کہ وہ ارکان عرب لیگ کی مملکتوں کی حدود میں پائپ لائنیں بچھائیں۔ شام کے متعلق خبر آئی کہ اس نے امریکی کمپنی کے اس اجارہ کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا ہے جو چھ ماہ پیشتر طے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دلچسپی سے خالی نہ تھی کہ مصر بھی عرب لیگ کے فیصلہ کا پابند ہوگا اور حجاز بھی غالباً موجود کمپنیوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے گا۔ حالات نے امریکہ کو یقین دلا دیا کہ عرب گیدڑ بھبکیاں نہیں دے رہے بلکہ وہ واقعی ایسے عزائم رکھتے ہیں۔ فلسطین کمیشن نے عربوں کے عزم غیر متزلزل کی تصدیق کی تو امریکہ کی آنکھیں کھلیں۔ ٹرومین نے محسوس کیا کہ وہ یہودی دوٹوں پر عربوں کو آسانی سے قربان نہیں کر سکتا۔

فلسطین میں بین الاقوامی پولیس کے مسئلہ نے اور مصیبت پیدا کر دی۔ ۲۹ر نومبر ۱۹۴۷ء کو امریکہ نے تقسیم کا فیصلہ منظور کرایا تھا۔ اس وقت سے لیکر اب تک کے پانچ مہینوں میں بین الاقوامی صورت حال اور نازک ہو گئی تھی۔ چیکوسلوواکیہ میں دیکھتے دیکھتے اشتراکی حکومت مسلط ہو گئی تھی۔ خرس روس کا سایہ فن لینڈ

پر پڑ رہا تھا۔ امریکہ روس کے مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کی نگاہ شمال میں ناروے پر تھی اور جنوب میں اٹلی پر۔ اٹلی میں انتخابات ہونے والے تھے۔ پانچ مغربی قومی ۔ برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ۔ کے ابین بچاس سال کا عسکری امداد کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ جسے امریکہ کی "مارشل امداد" کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ خود ٹرومین ایک حد تک جبری عسکری تربیت کی اپیل کر چکا تھا۔ ایسے نازک مرحلے پر امریکہ فلسطین میں بدامنی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بین الاقوامی فوجی مداخلت کا سوال بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اقوام متحدہ کے پاس منشور کی رو سے کوئی ایسی عسکری تنظیم نہیں تھی، اور اگر قومیں انفرادی طور پر فوجیں مہیا کرتیں تو روسی فوجیں ضرور فلسطین آپہنچتیں۔ امریکہ کسی حال میں بھی روسی فوجوں کو فلسطین میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ گوناگوں مصائب میں مبتلا ہو کر اور متضاد صورتوں سے دوچار ہو کر امریکہ نے رجعت کی اور ۱۹ مارچ کو اچانک یہ اعلان کر دیا کہ وہ اب تقسیم کا مؤید نہیں رہا۔ اس کے خیال میں فلسطین کو عارضی طور پر تولیت (Trusteeship) میں دیدیا جائے۔ نفاذ تقسیم میں جو خطرات و مہالک تھے اور جو سب کو صاف نظر آرہے تھے، امریکہ نے ان کا انکار کیا، لیکن بالآخر اسے بہت جلد ان کی بے پناہی کے آگے جھکنا پڑا۔ اس رجعت سے اس کے نہ محض اپنے وقار کو صدمہ پہنچا بلکہ اقوام متحدہ کے ادارہ کو ایک بیکار اور کھوکھلا ادارہ ثابت کر دیا۔ فلسطین اقوام متحدہ کی آزمائش تھا لیکن وہ اس میں پوری نہیں اتری۔ اس جمعیۃ نے پورے تیرہ مہینے فلسطین کے معاملہ پر بحث و تمحیص کی لیکن ناکام رہی۔ لیکن تقسیم ناقابل عمل نہیں ہے۔

نئی صلیبی جنگ

امریکہ نے عارضی تولیت کی جو تجویز پیش کی وہ بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اسی لیت و لعل، گو مگو اور تذبذب میں ۱۵ مئی کی فیصلہ کن تاریخ آپہنچی۔ برطانیہ فلسطین کو خالی کر کے رخصت ہو گیا۔ یہودیوں نے اسرائیلی سلطنت قائم کر لی اور فلسطین ایک اور صلیبی جنگ کا میدان بن گیا۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں دوسری صلیبی جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد صلیبی آج تک خطرے کا باعث نہیں بن سکے تھے۔ آل اسرائیل جو ایک دفعہ الٰہی انعام و فضائل سے محروم ہو کر تین ہزار سال سے اب تک لعنت و ذلت و مسکنت کی وادیوں میں سرگرداں رہی ہے۔ آج اپنی ساری

شیطنت کاریوں کے ساتھ قبلہ اول کی مقدس گلیوں میں تہذیب و انسانیت کو ذلیل و رسوا کر رہی ہے۔ یہودی جس "تابوت سکینت" کے طالوت کے عہد میں بھی مستحق نہیں تھے اور وہ انھیں بطور انعام خداوندی عطا ہوا تھا، تاکہ انھیں "ظالمین" کے بجائے "صابرین" اور "مومنین" بننے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آل اسرائیل فطرت کی مہلت بخشیوں سے کبھی استفادہ نہیں کر سکی۔ وہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ چالیس سال صحراؤں میں آوارہ نہیں رہی بلکہ تاریخ کے سارے دور میں وہ صحرا سے نکل کر کسی "مصر" میں داخل نہیں ہو سکی۔ آج وہ دنیا بھر کو لباس، خوراک اور دیگر اشیائے ضروری سے متعلق گوناگوں مصائب میں مبتلا کر کے سود در سود اور چور بازار کے ذریعہ کمائے ہوئے سرمایہ سے حاصل کردہ قوت اور اسلحہ سے وہی "تابوت سکینت" حاصل کرنے پر مضطرب ہیں جو قوت اور سرمایہ سے نہیں بلکہ قانون مشیت ایزدی کے تحت ملتا ہے۔ لیکن جو قوم فیضان سماوی سے محروم ہو جاتی ہے اس کے عمل و کمالات کی حد یہی فساد و طغیان ہوتے ہیں۔

یہودیوں نے ۱۵ مئی کے بعد فلسطین میں "اسرائیلی حکومت" کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کا مرکز تل عنیف ہے۔ اس حکومت کی حیثیت کیا ہے اور اس کی سرحدیں کونسی ہیں؟ یہ خود یہودی بھی نہیں جانتے لیکن بین الاقوامی سیاست کی طفلانہ حرکتوں نے اس حکومت کو کاغذی نہیں رہنے دیا۔ اسی سال امریکہ کا صدارتی انتخاب ہو رہا ہے۔ صدر ٹرومین گذشتہ انتخاب کے موقع پر نائب صدر منتخب ہوا تھا۔ لیکن روزویلٹ کی موت پر آئین کے مطابق صدر بن بیٹھا۔ وہ اس منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ڈیموکریٹک پارٹی جس کا کہ وہ نمائندہ ہے گذشتہ سولہ سال سے برسر اقتدار ہے۔ بعض حلقوں میں اسی وجہ کو اس پارٹی کی شکست کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ ٹرومین ہر وہ حرکت کرنے کے لئے تیار ہے جو اسے صدر بنائے رکھنے میں مفید ہو۔ یہودی اہم مہرہ ہیں۔ چنانچہ ادھر یہودیوں نے بے بنیاد اسرائیلی حکومت کا اعلان کیا ادھر صدر ٹرومین نے اسے تسلیم کر لیا۔ شکاگو ٹریبون نے اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۸ مئی کی اشاعت میں لکھا:-

ڈپلومیٹک عجلت میں ٹرومین نے ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ (اسرائیلی حکومت تسلیم کرنے میں) ٹرومین نے آدھ گھنٹہ کا بھی انتظار نہیں کیا۔ حکومت کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن کوئی بھی نہیں جانتا کہ

حکومت کیا ہے اور اس کی حدود کونسی ہیں۔ ٹرومین نے یہ کچھ جاننے کا انتظار نہیں کیا۔ اس کی نظر یہودی ووٹوں پر تھی۔ یہی اس کی عجلت کی علت ہے۔

شرق اردن کے وزیر خارجہ نے کہا کہ شرق اردن کی اقوام متحدہ کی رکنیت کی درخواست پر حفاظتی کونسل نے کئی مرتبہ سفارش کرنے سے انکار کیا ہے لیکن امریکہ نے یہودی حکومت کو فوراً بلا وجہ تسلیم کر لیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ امریکہ کی یہ طفلانہ غیر ذمہ داری بلا وجہ ہے!

امریکہ کے اقدامات میں شریک ہونے کے لئے روس نے بھی اسرائیلی حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔ امریکہ کے لئے یہ اور مصیبت پیدا ہو گئی ہے۔ اس نے روس ہی کے ڈر سے تو تقسیم کا فوجی قوت سے نفاذ نہیں کیا تھا۔ روس پھر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا ہے۔ بین الاقوامی سیاست ایک دوری گردش بنی جا رہی ہے۔

بعض حلقوں میں کہا جاتا ہے کہ اسرائیلی حکومت انہی علاقوں میں قائم ہو گی جو فیصلہ کے مطابق اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے یہودیوں کے سپرد کئے تھے۔ یہ استدلال باطل ہے۔ کیونکہ اقوام متحدہ کا فیصلہ تقسیم ختم۔ دفن ہو چکا ہے۔ خود امریکہ کے ایما پر اور امریکہ کے ہاتھوں۔

بہر حال اب صورت یہ ہے کہ عرب لیگ کی رکن حکومتیں خصوصیت سے لبنان، شام، شرق اردن، عراق اور مصر فلسطین میں مصروف جنگ ہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ انہوں نے کم از کم فلسطین کے معاملہ میں اپنے باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ عرب لیگ کا یہ کارنامہ اہم ہے اور مستقبل کے لئے خوش آئند۔

امتوں کی نجات

طلوع اسلام عربوں کے اس جہاد حریت میں اس سے بہتر پیغام نہیں دے سکتا جو علامہ اقبال نے "فلسطینی عرب سے" کہہ چکے ہیں:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذت نمود میں ہے

عربوں بلکہ مسلمانوں کا دعویٰ تاریخی، آئینی اور اخلاقی اعتبار سے برحق ہے۔ استعمارِ فرنگ نے پہلو بدل بدل کر اس دعوے کو غلط ثابت کرنے کی جو کوششیں کی ہیں اور جن کا جائزہ اوپر لیا جا چکا ہے وہ ایک ایک کر کے ناکام ہوئیں۔ اس لئے ناکام ہوئیں کہ ان کی بنیاد باطل تھی اور باطل بنیادوں پر حقیقی عمارت قائم نہیں کی جا سکتی۔ فلسطین عالمِ اسلامی کا مرکزی مسئلہ ہے۔ یہ مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے۔ اس کی مرکزیت اب بھی باقی ہے۔ جملہ عالمِ اسلامی اس نقطہ پر آج متفق و متحد ہے۔ فلسطین کا حادثۂ عظیمہ اتفاق و اتحاد کی نعمت بخش دے تو سودا سستا ہے۔ اس وقت ملل اسلامیہ اپنے اپنے مصائب میں مبتلا ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ بین الاقوامی مسابقت میں وہ پیچھے رہ گئی تھیں۔ انڈونیشیا، فلپائن، ملایا، جنوبی سیام، مشرقی پاکستان، شمال مغربی چین، وسطی ایشیا، مغربی پاکستان سے بحرِ روم کے جنوبی ساحل تک مسلمان اندرونی انقلابات سے دوچار ہیں۔ ان کی مصائب عظیم الشان ہیں اور مشکلات مہم۔ گنبد نیلوفری کیا رنگ بدلتا ہے اور اس بحر کی تہ سے کیا اچھلتا ہے؟ ان سوالات کا جواب پردۂ تقدیر میں ہے لیکن لا تھنوا ولا تحزنوا، اور ولکن اللہ رمٰی پر ایمان رکھنے والے یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ خوف و حزن کا مقام نہیں، یہ ظلمت کا وہ دور آخری ہے جو روشنی سے قریب تر ہوتا ہے۔ ستاروں کی تنک تابی بلکہ خون صد ہزار انجم ——— صبح روشن کی دلیل ہے۔ یہ سب تیاری ہے ——— ھِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ۔ مطلع فجر کی ساعت آپہنچی ہے۔ وہ وقت۔ دور نہیں کہ اَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ کا آفتاب "سوا نیزے" تک آچکا ہوگا۔

عالمِ نو

عرب ممالک میں ہنوز اختلافات پائے جاتے ہیں جن کی علت شخصی حکومتیں ہیں۔ حسین شریف مکہ کی اولاد، ابن سعود کے ہاتھوں حجاز و عرب سے محروم ہو گئی ہے لیکن شرق اردن اور عراق اس کے قبضہ میں ہے۔ وہ ابنِ سعود کو غاصب سمجھتی ہے اور خلافت قائم کر کے خلیفۃ المسلمین بن جانے کے خواب دیکھ رہی ہے۔ ابن سعود اپنے آپ کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتا ہے کیونکہ اس کے قبضہ میں مکہ ہے۔ شاہ فاروق بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں، وہ خدمت کعبہ کی وجہ سے خلافت کا استحقاق ظاہر کر رہا ہے۔ فلسطین میں نشاشیبی خاندان اور حسینی خاندان کی رقابت ۱۹۳۶ء میں ایک حد تک ختم ہوئی جبکہ جہادِ حریت کی قیادت حتمی طور پر مفتی امین الحسینی کے سپرد ہو گئی۔ حسینی قیادت عبداللہ والی شرق اردن

کی راہ میں اہم رکاوٹ ہے۔ بنو ہاشم کی فلسطین، حجاز وغیرہ پر نگاہ ہے کیونکہ قیام خلافت کے یہ اہم نقطے ہیں۔ پہلی عالمگیر جنگ میں حسین نے انگریزوں سے میکموہن کی زبانی یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ برطانیہ عربوں میں ایسی خلافت قائم کرنا چاہتا ہے جس کی قیادت آل ہاشم کے ہاتھ میں ہو۔ عراق اور شرق اردن کس حد تک اس آرزوئے خلافت سے پاک ہو چکے ہیں اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اتنا غنیمت ہے کہ فلسطین کے مسئلہ پر متحد ہو گئے۔

یہ وقت مسئلہ خلافت پر بحث کرنے کا نہیں۔ اس پر طلوع اسلام میں وقتاً فوقتاً روشنی ڈالی جاتی ہے۔ لہٰذا اس وقت اسی اجمال پر اکتفا کی جاتی ہے کہ خلافت اسلامیہ شخصی حکومت کا نام نہیں۔ یہ نہ قوت کے بل بوتے پر مل سکتی ہے نہ وراثتاً حاصل ہو سکتی ہے۔ خلافت ملل اسلامیہ کی مجموعی اور مشترک حکومت ہے، وہ حکومت جس کے جملہ اجزا شریک حکم ہوں نہ کہ محکوم، محکوم ہوں تو سب خدا کے۔

اس وقت فلسطین میں صرف عربی فوجیں لڑ رہی ہیں۔ ترکی، ایران، افغانستان، پاکستان شریک جنگ نہیں ہوئے۔ فلسطین کے لئے عرب اور غیر عرب کی تقسیم مستحسن نہیں۔ فلسطین عربوں کا نہیں مسلمانوں کا ہے۔ مسلمان کرۂ ارض پر کہیں بستے ہوں وہ اس کی حرمت پر کٹ مرنے کو زندگی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اس نقطہ پر تمام ممالک اسلامیہ کو مرکوز ہو جانا چاہیئے۔

پاکستان میں اس وقت فلسطین سے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس افسوسناک حقیقت کا مظہر ہے کہ پاکستان کی حکومت سابقہ اجنبی حکومت ہے جسے فلسطین سے وہ جذباتی وابستگی نہیں جو عوام کو ہے جلسہ عوامی مظاہرے غیر سرکاری طور پر ہو رہے ہیں۔ بغیر حکومت کے عملی اقدام مشکل ہے۔ حالیہ پریس کانفرنس میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ حکومت پاکستان عربوں کو کیا امداد دے گی، سر ظفر اللہ خاں نے کہا کہ حکومت نے ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کیا۔ یہ تاخیر اور سرد مہری ہے۔ کیا حکومت اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریگی اور عوام حکومت سے علیحدہ ہو کر نہیں بلکہ حکومت کو ساتھ ملا کر مناسب اقدام کریں گے؟ ہندوستان کے مسلمان خاموش ہیں۔ ہمیں ان کی مجبوریوں کا علم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ حکومت ان کی نہیں، لیکن اس کی پیشرو حکومت بھی تو ان کی نہیں تھی۔ وہ بھی کم استبدادی نہیں تھی۔ حق کی بات جب کہی جا سکتی تھی تو

اب بھی کہی جا سکتی ہے۔ حکومتِ ہندوستان کی ہمدردی کسی سے بھی کیوں نہ ہو، وہ مسلمانوں کو عربوں سے اظہارِ ہمدردی کرنے سے روک نہیں سکتی۔ اور اگر وہ روکنے پر ہی اتر آتی ہے تو پھر اس بستی میں کیا رہنا جس کے 'اہل' اس قدر 'ظالم' ہوں!

عمومی حیثیت سے عالم اسلامی میں زندگی کی نئی تڑپ محسوس ہو رہی ہے۔ پاکستان کے قیام نے ممالک اسلامیہ میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ پاکستان اور فلسطین فیصلہ کن نقطے اور ہماری آزمائش ہیں — لِنَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ کے مصداق مشیت ہمیں میدانِ عمل دے کر یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ ہم کس حد تک اس کے مقاصد کو پورا کرتے ہیں۔ رب العزت جنہیں ملک عطا کرتا ہے وہ نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ قائم کرتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔ ممالک اسلامیہ بالخصوص پاکستان کے لئے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر اپنا عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

ہم نام کو آزاد ہیں لیکن غلامی سیاسی غلامی ہی نہیں ہوتی۔ ذہنی سلاسل میں گرفتاری وہ غلامی ہے جو انسانیت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ حقیقی آزادی ان اطواق و سلاسل سے نجات ہے اور یہ نجات بقول اقبال

خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

ہماری ذہنی غلامی کا یہ عالم ہے کہ انگریز کے پنجۂ استبداد کے خلاف مسٹر گاندھی کی انفعالی سیاست نے احتجاج کے جو طرق و انداز وضع کئے تھے، ہم آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنی حد پرواز کو ان سے آگے نہیں سمجھتے۔ چنانچہ فلسطین کے حادثۂ عظمیٰ کی خبر ملنے کے بعد ہم نے جو کچھ آج تک کیا ہے وہ سیاہ جھنڈیوں، جلوسوں، جلسوں، ایزدلیشنوں اور ہڑتالوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہم ابھی تک سمجھے ہی نہیں کہ یہ انداز احتجاج ہمارے عہدِ غلامی کی بیکسی و بے بسی کے ماتم گذار ہیں۔ زندہ قومیں اپنے احتجاجات کے مظاہرے تلواروں کی چمک اور نیزوں کی کھنک سے کیا کرتی ہیں۔ لیکن ہم مجبور ہیں۔ صدیوں کی خوئے غلامی ہمارے رگ و پے میں اس درجہ سرایت کر چکی ہے کہ ہم قفس کی تیلیوں سے ماورا کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔

وہ فریبِ خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں — اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

باقی رہی ہماری حکومت۔ تو ہم حیران ہیں کہ اسے کن الفاظ میں سمجھائیں کہ حضور رسالتمآب نے کہ جن کے پیام رحمت نے نوع انسان کے افراد منتشرہ کو کارواں، اور اقوام وملل کے نجوم متفرقہ کو کہکشاں بنا دیا، جب فرمایا تھا کہ تمام روئے زمین کے مسلمان ایک جسد واحد ہیں تو اس سے مقصود اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ اگر کبھی پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھے تو آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آئیں۔ اگر افریقہ کے صحراؤں میں کسی حبشی کے سر میں درد ہو تو ایران کے سبزہ زاروں میں محوِ گلگشت شاہنشاہ کا تاج اس کے لئے وبالِ دوش ہو جائے۔ اگر شام کے میدانوں میں کسی اونٹ چرانے والے کے سینہ پر کسی ناہنجار کا تیر آ لگے تو اس کی انی چین کے محلات میں سونے والے خاقان کے کلیجے سے نکلے۔ اگر مراکش کے چرواہے کے خیمے کی طناب کو کوئی دشمن ملتِ بیضا کاٹ ڈالے تو قسطنطنیہ کے قصرِ احمر کے ستونوں میں تزلزل واقعہ ہو جائے۔ نہیں! اگر دشتِ حجاز میں کسی بیوہ کے بچے کی طرف کوئی نگاہِ بد سے دیکھے تو تمام عالم اسلامی کی انگلیاں اس کی آنکھ نکال لینے کے لئے بیک وقت اٹھ آئیں۔ سو قسم ہے اس خدائے کل کی کہ جس نے تمام روئے زمین کے کلمہ پڑھنے والوں کو کل مومن اخوۃ کے رشتۂ محکم میں منسلک کر کے ملتِ حنیفہ کی یوں شیرازہ بندی کر دی، آج جبکہ فلسطین کے میدانوں میں عرب مجاہدین کا خون 'باندازِ تو' قانونِ باغبانیٔ صحرا کی نوشت میں صرف ہو رہا ہے۔ اگر صفحۂ ارض پر کسی ایک مسلمان کو بھی چین کی نیند آ جائے تو قیامت کے دن "لیس منی" کی شدید لعنت کا استقبال کرے گی۔ سو اس کے بعد کیا ہے کہ ہمیں اس کھلے ہوئے فیصلہ کے اعلان سے روکنا ہے! پاکستان کی آزادی کے بعد یہ پہلا موقعہ آیا ہے کہ وہ دنیا کو بتا دے کہ مسلمانوں کا شعار یہ ہے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر

آج فلسطین کے ارض مقدس کا ذرہ ذرہ پکار رہا ہے کہ من انصاری الی اللہ!

اے بندۂ مومن! تو کہاں؟ تو کہاں؟؟

دیکھیں، نحن انصار اللہ کہنے کی سعادت کس کس کے مقدر میں لکھی ہے۔

خاتمۂ کلام سے پہلے ہم ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ ضروری سمجھتے ہیں جس میں مسلمان ایک

عرصہ سے مبتلا چلا آرہا ہے۔ مسلمانوں میں عام طور پر مشہور یہ ہے کہ یہود کو خدا نے مغضوب علیہ قرار دیا ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا میں کبھی اپنی سلطنت قائم نہیں کر سکیں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن نے یہودیوں کو مغضوب علیہ وملعون قرار دیا ہے۔ لیکن اس کی تخصیص صرف یہود کے ساتھ نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے تمام ان لوگوں کو جو قرآن کو نہیں مانتے مغضوب علیہ قرار دیا ہے (۲/۹۰)، قرآن میں غور وفکر نہ کرنے والوں کو ملعون کہا ہے (۴۷/۲۴-۲۳)۔ دنیا میں فساد برپا کرنے والوں کو بھی اپنے غضب وعتاب کا مورد بتایا ہے (الفیلا) اور ملوکیت کے استبداد کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا ہے۔ اور یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ قرآن سے انکار کرنے والی قومیں دنیا میں حکومت و سلطنت کی مالک ہیں۔ یہ ہم کسی دوسرے وقت بتائیں گے کہ قرآن نے جس ذلت ومسکنت کو یہود اور اہل کتاب کے ساتھ مخصوص کیا ہے اس سے مفہوم کیا ہے۔ اس وقت ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان اس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ یہود اللہ کے غضب وعتاب میں ہیں اور یہ خود اس کے منعم علیہ ہیں۔ مگر یہود مغضوب ومعتوب ہیں تو مسلمان، جو قرآن سے اس درجہ بے اعتنائی برتتے ہوئے اور ملوکیت کی لعنت کو قائم کئے ہوئے ہیں، کبھی خدا کے محبوب ومقبول نہیں ہو سکتے۔ قرآن تو باہمی بغض وعداوت رکھنے والوں اور مسلمانوں کو عمداً قتل کرنے والوں کو بھی مغضوب وملعون ٹھہراتا ہے (۴/۹۳ ، ۵/۶۴) لہٰذا فلسطین کی جنگ ان قوموں کے درمیان ہے جن میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ خدا کی محبوب ہے اور اس لئے اس کی تائید ونصرت کی مستحق ہے۔ یہ جنگ طبیعی اور مادی اسباب وعلل کے تحت عمل میں آرہی ہے۔ اس لئے اس کا فیصلہ بھی مادی قوتوں کی کمی اور زیادتی کی بناء پر ہوگا۔ جو قوم زیادہ قوت فراہم کرے گی وہی کامیاب ہو جائے گی۔

البتہ اگر مسلمان ان اعمالِ حیات سے مجتنب ہو جائیں جو خدا کے غضب کا موجب بنتے ہیں۔ اس کے ابدی ضابطۂ قوانین (قرآن کریم) کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال لیں اور زمین پر "آسمان کی بادشاہت" قائم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں تو پھر البتہ اللہ کی

تائید و نصرت ان کے ساتھ ہو گی۔ جو انکی مادی کمی کو ہر طرح سے پورا کر دے گی۔ اور اس وقت خدا کا یہ اٹل وعدہ پورا ہو جائیگا کہ ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا (۴/۱۴۱) اللہ ہرگز کفار کو مومنین پر غلبہ نہیں دیگا۔

یہود کی مغضوبیت کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اعمال و کردار اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے جو خدا کی میزان میں شرط محبوبیت بنتے ہیں۔ ان کے اقوال مومنانہ لیکن انداز سب کافرانہ تھے۔ وہ زبان سے کچھ کہتے تھے جسے ان کے اعمال جھٹلاتے تھے۔ اس لئے اس روش زندگی کے ساتھ محبوبیت خداوندی (نحن ابناء اللہ) کا دعوے حقیقت و صداقت کے ساتھ مذاق کرنے کے مراوف تھا جس کا فطری نتیجہ غضب و عتاب خداوندی ہوتا ہے کہ خدا کی نعمت و رحمت مشروط ہے ایمان و اعمال صالحہ سے۔ اس روش زندگی کا مرتکب یہودی ہو تو مسلمان ہو تو، دونوں مغضوب ہوں گے۔ جنگ فلسطین میں اس زعم باطل میں کہ خدا ان کے ساتھ ہے اور مسلمان یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ خدا ان کے ساتھ ہے۔ اور خدا کا ارشاد یہ ہے کہ

لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوء یجز بہ ولا یجد لہ من دون اللہ ولیا ولا نصیرا (۴/۱۲۳)

(خدا کی نصرت) نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے، اور نہ ہی اہل کتاب کی آرزوؤں پر وہ تو موقوف ہے ایمان و عمل پر)۔ جو کوئی برائی کرے گا مزدوری ہے کہ اس کا بدلہ پائے۔ پھر اللہ کے سوا نہ کوئی اسے دوست ملیگا نہ مددگار

خدا تو کہتے ہی اسے ہیں جس کے قانون مکافات میں نہ کسی کی طرفداری ہو نہ کسی کی مخالفت۔ اس لئے اگر مسلمانوں نے خدا کو اپنے ساتھ ملانا ہے، تو اس کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق عمل کریں۔ اور اگر ایسا نہیں کرتے تو اپنے معاملات میں خدا کو کھینچ کر نہ لائیں۔ پھر یہ معاملات ان ہی آئین و دستور کے مطابق طے پائیں گے جن کے ماتحت یہ کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ اگر دنیا بھر کے مسلمان اس ایک محاذ پر جمع ہو جائیں اور اپنے خدا سے عہد کر لیں کہ وہ انسانی حکومتیں قائم کرنے کے بجائے اللہ کی حکومت اختیار کریں گے اور جس سرزمین میں انہیں غلبہ حاصل ہو گا اس میں اس کے نازل کردہ ضابطہ قوانین کو نافذ کریں گے، اور اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیں۔ تو پھر دیکھئے اس ایمان و عمل کا نتیجہ کس طرح انہیں دنیا بھر کی سرفرازیاں عطا کر دیتا ہے کہ

للہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین ولکن المنافقین لا یعلمون

"علماء ہند"

آہ یہ وقت بھی آنے کو تھا اللہ غنی
علماء ملتِ بیضا کی کریں بیخ کنی

نہیں اپنوں کیلئے تلخ کلامی کے سوا
صرف غیروں کیلئے وقف ہے شیریں سخنی

بہرِ اغیار کیا دیں سے سیاست کو جدا
جس سیاست پہ خود اپنوں سے لڑائی تھی ٹھنی

کر ہی سکتے ہیں وہ کب عشقِ حرم کا دعوے
اُلفتِ دیر کو سمجھے ہیں جو حب الوطنی

کیوں نہ برہم کرے جمعیت ملت اے شیخ
اہلِ سامانِ براہیمؑ کی یہ برہمنی

دامِ اصنام میں پھنس کر جو رہے وہ آزاد
نامِ اسلام جو لیتا ہو وہ گردن زدنی

کیا تماشا ہے کہ دینِ عربی کا دشمن
ایک مکی بنے اور دوسرا ٹھیرے مدنی

ان کے وعدوں کا بتوں کو بھی نہ آئیگا یقین
جو روا رکھتے ہیں اللہ سے پیماں شکنی

(جناب اسد ملتانی)

پیامِ اقبالؒ

از عبدالرحمن طارق بی۔اے

"پیامِ اقبال" اردو زبان میں اپنے موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے جو علامہ اقبال کی زندگی ہی میں تیار ہو گئی تھی۔ یہ کتاب جب علامہ مرحوم کے حضور پیش کی گئی تو بعد از مطالعہ ارشاد فرمایا:۔ "اس میں شک نہیں کہ "پیامِ اقبالؒ" میرے پیام و کلام کی نہایت حسین و مؤثر ترجمانی ہے اور اس سے میرے بعض اہم زاویہ ہائے فکر و نظر پر بصیرت افروز روشنی پڑتی ہے!"

اس کتاب میں اٹھارہ پرمغز اور فاضلانہ مقالات ہیں جنہیں سے ہر مقالہ حسبِ عنوان علامہ مرحوم کے دقیق فارسی و اردو کلام کی تشریح بھی کرتا ہے۔ اندازِ بیان نہایت فصیح و دلچسپ تشریحِ اشعار تسلی بخش اور زبان عام فہم ہے۔ اب تیسرا ایڈیشن نہایت حسین و جمیل صورت میں چھپا ہے۔ اپنی فرمائش جلد روانہ فرمائیے کہ ختم ہونے پر پھر انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ ضخامت ۔ ۲۶۰ صفحات، قیمت مجلد دو روپے بارہ آنے۔

دفتر اقبال اکیڈمی ایبک روڈ، انارکلی لاہور

"Mullickson"